ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے پی۔ ایچ ڈی۔ ڈی لٹ (مرحوم)

رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ
مطابق، جون ۱۹۸۴ء
جلد: ۳، شمارہ: ۴

مدیر اعزازی
ڈاکٹر ابصار احمد
ایم اے۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی
معاون مدیر
حافظ عاکف سعید
ایم اے فلسفہ

یکے از مطبوعات:
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، فون ۸۵۲۶۱۱
مطبع: آفتاب عالم پریس
زرسالانہ ۳۰/- روپے
قیمت فی شمارہ ۳/- روپے

حرفِ اوّل ——— ۳
ڈاکٹر اسرار احمد

الٓمّٓ (سورۃ قصص) ——— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد

خصوصیاتِ قرآن حکیم ——— ۱۲
پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم)

علامہ سید سلیمان ندوی (ایک عظیم مفسرِ قرآن) ۲۰
ڈاکٹر غلام محمد

تفسیر مواج کا اجمالی تعارف ——— ۳۱
پروفیسر محمد اسلم

قرآن عظیم کی زبان ——— ۳۹
محمد خورشید

سیرۃ الخلیل (باب ثانی) ——— ۴۵
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

درس حدیث ——— ۵۰
ریاض الحق

قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت ——— ۵۳
مولانا محمد تقی امینی

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام ——— ۵۷
مولانا محمد طاسین

تصانیف : ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

۱	اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ۔ کرنے کا اصل کام		۱/۵۰
۲	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	ادنیٰ / اعلیٰ	۳/- / ۴/-
۳	راہِ نجات ۔ سورۃ والعصر کی روشنی میں	عظیم / مختصر	۳/- / ۲/-
۴	دعوت الی اللہ		۱/۵۰
۵	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ بعثت	ادنیٰ / اعلیٰ	۳/- / ۴/-
۶	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جماعتی تعلق کی بنیادیں	ادنیٰ / اعلیٰ	۲/- / ۳/-
۷	قرآن اور امن عالم		۱/۵۰
۸	علامہ اقبال اور ہم		۲/-
۹	عظمتِ صوم		۴/-
۱۰	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ		۱۰/-
۱۱	مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب		۱۲/-
۱۲	عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی		۳/-
۱۳	سراقلیدیم		۷/-
۱۴	مطالباتِ دین		۸/-
۱۵	تحریکِ جماعت اسلامی	ادنیٰ / اعلیٰ	۱۰/ / ۲۰
۱۶	شہیدِ مظلوم	ادنیٰ / اعلیٰ	۳/ / ۴/
۱۷	اسلام اور پاکستان		۵/-
۱۸	تنظیم اسلامی کی دعوت		۴/-
۱۹	سانحہ کربلا		۳/-
۲۰	رسولِ کامل صلے اللہ علیہ وسلم		۶/-
۲۱	مسلمانوں کے فرائضِ دینی اور اسوۂ رسول		۶/-
۲۲	معراج النبی		۳/-
۲۳	اسلام میں سنت کا مقام		۱۰/-

عربی ترجمہ :

۱	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن ؟	۵/-

فارسی ترجمہ :

۲	دین قرآن بگردن مسلمان	زیرطبع

انگریزی تراجم :

۳	The Obligations Muslims owe to the Quran.	۵/-
	The way to Salvation—in the light of Surah Al-'Asr.	۵/-
۵	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.	-/-
۶۰	The Quran & World Peace.	-/-
۷	Rise & Decline of Muslim Ummah.	۵/-

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے پی۔ ایچ ڈی۔ ڈی لٹ (مرحوم)

رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ
مطابق، جون ۱۹۸۴ء
جلد: ۳، شمارہ: ۴

مدیر اعزازی
ڈاکٹر ابصار احمد
ایم اے۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی
معاون مدیر
حافظ عاکف سعید
ایم اے فلسفہ

یکے از مطبوعات:
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، فون ۸۵۲۶۱۱
مطبع: آفتاب عالم پریس
زرسالانہ -/۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ -/۳ روپے

حرفِ اوّل ——— ۳
ڈاکٹر اسرار احمد
الٓمٓ (سورۃ قصص) ——— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد
خصوصیاتِ قرآن حکیم ——— ۱۲
پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم)
علامہ سید سلیمان ندوی (ایک عظیم مفسرِ قرآن) ۲۰
ڈاکٹر غلام محمد
تفسیر مواج کا اجمالی تعارف ——— ۳۱
پروفیسر محمد اسلم
قرآن عظیم کی زبان ——— ۳۹
محمد خورشید
سیرۃ الخلیل (باب ثانی) ——— ۴۵
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی
درسِ حدیث ——— ۵۰
ریاض الحق
قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت ——— ۵۳
مولانا محمد تقی امینی
مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام ——— ۵۷
مولانا محمد طاسین

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کے فیصلے کے مطابق آئندہ

قرآن اکیڈمی رفاقت (فیلوشپ) سکیم

کے لئے نوجوانوں کے انتخاب کیلئے تمہید کے طور پر

دو سالہ تدریسی نصاب

کا سلسلہ شروع کیا جائیگا جسمیں پہلے سال اکثر و بیشتر وقت عربی قواعد و ادب کی تعلیم پر صرف ہوگا (صرف ضمناً کچھ فارسی بھی پڑھائی جائیگی!) اور دوسرے سال تفسیر قرآن میں مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمد) حدیث شریف میں مشکوٰۃ المصابیح، منطق میں مرقاۃ، اصول فقہ میں نور الانوار اور فقہ میں نور الایضاح اور منتخب حصے کنز الدقائق کے پڑھائے جائیں گے ـــــ اور جو نوجوان اس کورس کو کامیابی سے پورا کر لیں گے اور اُن کے بارے میں محسوس ہوگا کہ تحقیقی و تخلیقی کام کی صلاحیت رکھتے ہیں صرف ان ہی کو رفاقت سکیم میں لیا جائے گا۔

اس کورس کے لئے ایم اے۔ ایم ایس سی ـــــ اور بی اے، بی ایس سی کے امتحانات کم از کم سیکنڈ ڈویژن میں پاس شدہ نوجوانوں کو لیا جائے گا اور اس دو سال کے عرصے کے دوران مقدم الذکر کو ایک ہزار روپے ماہانہ اور موخر الذکر کو آٹھ سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اگرچہ اس میں سے ماہ بماہ ادائیگی صرف پچھتر فیصد کی ہوگی (یعنی علی الترتیب ۷۵۰/- اور ۶۰۰/- روپے ماہانہ) بقیہ پچیس فیصد انجمن کے پاس اُن کے حساب میں جمع رہے گا اور کورس کی کامیابی کے ساتھ تکمیل پر یکمشت ادا کر دیا جائے گا۔ جو طالبعلم درمیان میں چھوڑ جائیں گے یا اُن کے نامناسب طرز عمل یا غیر تسلی بخش رفتار کار کی بنا پر اکیڈمی ان کا اخراج کر دے گی اُن کی یہ جمع شدہ رقم ضبط کر لی جائے گی!

اس کورس کا آغاز ان شاء اللہ یکم اگست ۸۴ء سے ہو جائے گا۔ شمولیت کے خواہاں نوجوان زیادہ سے زیادہ ۱۵ جولائی تک اپنی درخواستیں اپنی سندات کی نقول کے ساتھ زیر دستخطی کو قرآن اکیڈمی، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور-۱۴ کے پتے پر ارسال کر دیں۔

(نوٹ)

ایم بی بی ایس، بی ڈی ایس اور بی ایس سی انجینیرنگ کو بھی ایم اے اور ایم ایس سی کے مساوی شمار کیا جائے گا

المعلن: ڈاکٹر ابصار احمد، آنریری ڈائرکٹر، قرآن اکیڈمی، لاہور

ابصار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حرفِ اوّل

"حکمتِ قرآن" کا زیرِ نظر شمارہ قارئین کی خدمت میں وسطِ رمضان کے بعد پہنچے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کی برکات سے کما حقہٗ متمتع ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین ـــــ نماز کی طرح روزہ بھی دینِ اسلام کا ایک بنیادی رکن ہے۔ عربی میں اس کو "صوم" کہتے ہیں۔ صوم کے لفظی معنیٰ رک جانے اور باز رہنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں چند مقامات پر روزہ کو "صبر" بھی کہا گیا ہے جس کے معنیٰ ضبطِ نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے صاف ظاہر ہے کہ تعلیماتِ دین میں روزہ کا کیا مفہوم ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ مذاہب عالم میں رائج رہا ہے۔ داعیاتِ شکم و فرج کو نفسِ انسانی کے مجموعی مطالبات میں جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ روزے میں انہی زبردست اور منہ زور خواہشوں پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ مسلسل ایک ماہ تک روزانہ بارہ بارہ اور چودہ چودہ گھنٹے انسان اپنے نفس کے ان مطالبات پر قفل ڈالے رہتا ہے۔ مسلسل ایک ماہ کی یہ مشق انسان کے اندر صبر و ضبط کی بے پناہ قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اور پھر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ایک مومنِ صادق اقامتِ دین اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ میں پیش آنے والی تکالیف اور شدائد کا آسانی اور کامیابی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے اعتراف سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس حقیقت کا اعتراف دراصل اس امر کا اعتراف ہے کہ روزے سے حاصل شدہ قوت سے ایک مومن دین کی پیروی اور احکام الٰہی کی اطاعت میں نفس اور شیطان کی ساری مزاحمتوں سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ صحیح معنوں میں ایک خدا ترس اور متقی انسان بن جاتا ہے۔

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا یعنی اس کی تنزیل شروع ہوئی۔ اور اسی ماہ مبارک میں وہ رات ہے جس کی عبادت کو ہزار مہینے کی عبادت سے افضل قرار دیا گیا۔ اسی رات (لیلۃ القدر) کو قرآن کا انزال سماء دنیا پر کیا گیا۔ ان تمام حقائق سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ رمضان کے صوم اور قرآن کریم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ بہت سی احادیثِ

رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کا پروگرام ان دو سے عبارت ہے۔ یعنی دن کے اوقات میں روزہ اور رات کو قرآن کے ساتھ شب بیداری اور اس کا نماز میں پڑھنا۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مروی روایت سے اسی امر کی صراحت ہوتی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَىْ رَبِّ اِنِّىْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَ الشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ ـــــ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا)۔ روزہ عرض کرے گا۔ اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما)۔ اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا! آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما!) چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا۔ اور خاص مراحم خسروانہ سے اس کو نوازا جائے گا)

سلسلۂ تقاریر الٓمٓ

سُورۃ القصص

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم: نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰسٓمٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ
مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّ فِرْعَوْنَ
عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً
مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ
كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

آمنت باللہ صدق اللہ العظیم

حروف مقطعات طٰسٓمٓ سے شروع ہونے والی دوسری سورہ سورۃ قصص ہے۔ یہ سورہ مبارکہ ۸۸ آیات اور ۹ رکوعوں پر مشتمل ہے اور مصحف میں بیسویں پارے کے تقریباً درمیان میں واقع ہوئی ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں تمہیدی آیات یعنی طٰسٓمٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ کے فوراً بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات بالخصوص اوائل زندگی کے تفصیلی حالات شروع ہو جاتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ کے بعد غالباً یہ سب سے بڑا اور مفصل حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سورۃ قصص ہی میں آئے ہیں۔ سورہ طٰہٰ اور سورہ شعراء دونوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان

میں یہ چیز مشترک نظر آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات کا ذکر شروع ہی میں ہوتا ہے۔

کوہ طور پر آنجناب کی پہلی حاضری یعنی جبکہ آپ نبوت و رسالت سے سرفراز فرمائے گئے۔ اس کے بعد سے دعوت و تبلیغ کے تمام مراحل، پھر ہجرت اور قوم فرعون کی تباہی و بربادی اور ہلاکت، یہ ہیں وہ حالات کہ جو سورہ طٰہٰ اور سورہ شعراء دونوں میں آئے ہیں۔ سورہ قصص میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس میں زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے اور پھر بچپن کے حالات پھر جوانی کے واقعات پھر خاص طور پر وہ واقعہ کہ جب ایک شخص آپ کے ہاتھ سے بلا قصد قتل ہو گیا اور اسکے نتیجے میں اس کا اندیشہ ہوا کہ آپ کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔ تو آپ نے مصر کو چھوڑ کر مدین کی طرف ہجرت اختیار کی، اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور وہاں جو حالات و واقعات پیش آئے، شیخ مدین کی خدمت میں آپ کا رہنا اور ان کی ایک صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہونا اور پھر اپنے گھر والوں کو لے کر واپس آتے ہوئے جب کوہ طور کے قریب سے گزرے تو نبوت اور رسالت سے سرفراز ہونا۔ بقول شخصے کہ ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے

یہ وہ حالات و واقعات ہیں کہ جو سورہ قصص میں زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔ نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے بعد کے حالات و واقعات کا یہاں اجمال کے ساتھ ذکر ہے۔ اسی ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک دعا نقل ہوئی ہے جب آنجناب مصر سے بے سروسامانی میں نکلے تھے۔ اندازہ کیجئے پورا صحرائے سینا یکہ و تنہا پا پیادہ قطع کر کے اتنی

طویل مسافت طے کر کے جب مدین کی آبادی میں پہنچے اور ابھی آبادی سے باہر ہی تھے کہ دیکھا کہ کنویں پر ہجوم ہے، وہاں بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ دو بچیاں بھی ہیں کہ جو اپنے گلّے کو لے کر ایک طرف کھڑی ہیں اس انتظار میں کہ جب سب لوگ پانی پلا کر چلے جائیں تو پھر وہ بھی کوشش کریں اور اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو پانی پلا سکیں۔ خدمتِ خلق کا جذبہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام میں تھا۔ اور آپ کی طبیعت میں فتوت کے جو جوہر موجود تھے۔ ان کا اس موقع پر ظہور ہوا۔ آپ نے آگے بڑھ کر ان کی بھیڑوں اور بکریوں کو پانی پلایا۔ اور پھر واپس آکر درخت کی ایک چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ اس وقت وہ کسمپرسی کا عالم تھا کہ ایک بالکل اجنبی ملک ہے، اجنبی آبادی ہے کوئی جاننے والا کوئی پہچاننے والا نہیں۔ اس وقت زبان پر الفاظ آئے۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ۝

"پروردگار میں اس وقت احتیاج کی اس انتہا کو پہنچ چکا ہوں کہ میری جھولی بالکل خالی ہے۔ تو اس میں جو بھی ڈال دے گا وہ تیرا فضل و کرم ہے، ہر اس خیر کا محتاج ہوں جو تیری طرف سے عنایت ہو جائے" یہ ایک انتہائی دل شکستہ شخص کے احساسات کی ترجمانی ہے۔

یاد رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی نقل فرمائی ہے۔ حدیث قدسی اُس حدیث کو کہتے ہیں جو اگرچہ ہوتی حدیث ہے کہ حضورؐ ہی کے الفاظ مبارکہ ہیں لیکن اس میں کلام اللہ کا نقل ہو رہا ہوتا ہے۔ اس میں الفاظ یہ ہیں کہ انا عند منکسرۃ القلوب

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے ان بندوں کے بہت قریب ہوتا ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہوں جو شکستہ دل ہوں۔ جن کی اُمیدیں اور آرزوئیں کسی سبب سے منقطع ہو گئی ہوں۔ جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ میں

اپنے ان بندوں کے بہت قریب ہو جاتا ہوں"۔ اسی کا نقشہ یہاں نظر آتا ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ۔

اس سورہ مبارکہ کے آٹھویں رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ایک سرمایہ دار شخص کا بیان ہے جس کا نام بہت مشہور ہے — قارون — جس کی دولت ضرب المثل ہے "قارون کی سی دولت" یہ شخص بنی اسرائیل ہی میں سے تھا۔ لیکن جیسا کہ ہوا کرتا ہے عام طور پر محکوم قوموں کے بعض افراد حاکموں کے ساتھ ساز باز کر لیا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی ملی بھگت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ بہت سے فائدے اٹھاتے ہیں اور بڑی دولت جمع کر لیتے ہیں وہ غیر حکومت سے اور ظالمانہ حکومت سے خطابات بھی حاصل کرتے ہیں۔ جاگیریں بھی مل جاتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک سرمایہ دار شخص یہ قارون تھا۔ جس کی دولت کا قرآن مجید میں اندازہ دینے — کے لئے یہ تمثیل بیان کی کہ اس کے خزانوں کی کنجیوں کو متعدد تنومند لوگ بمشکل اٹھا سکتے تھے۔ وہ شخص ہے اور سرمایہ دارانہ مزاج اور اس کی ذہنیت کی عکاسی ہو رہی ہے ایک مکالمے میں۔ کنبے والوں نے اس سے کہا:

وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (۷۷)

اے قارون! اللہ نے تیرے ساتھ بڑی بھلائی کی ہے تجھے بہت سی دولت دی ہے۔ روپیہ پیسہ دیا ہے تو تو بھی اس دولت کے ذریعے کچھ نیکیاں کما۔ خلق خدا کی خدمت میں اپنی دولت کو صرف کر۔ جیسے رب نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو اس کی مخلوق کے ساتھ بھلائی کر — جس پر اس نے بڑے فخر و غرور اور بڑے تکبر کے ساتھ یہ کہا۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (۷۸)

یہ دولت میں نے اپنے علم، اپنے فہم، اپنی دانش، اپنی صلاحیت، اپنی استعداد، اپنی قوت اور محنت سے حاصل کی ہے۔ تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ یہ مجھے اللہ نے دی ہے۔ حالانکہ یہ تو میرے زور بازو کی کمائی ہے۔ یہ میری صلاحیتوں کا ثمرہ ہے۔ میری دُور بینی اور پیش بینی کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے پاس یہ دولت جمع ہوئی ہے۔ یہی ہے درحقیقت سارے فساد کی جڑ — قرآن مجید اس جڑ کو کاٹتا ہے۔ یہ تصور دے کر کہ اس دنیا میں انسانوں کو جو بھی کچھ ملتا ہے خواہ اس کے لئے محنت خود انہوں نے کی ہو، کھیتوں میں ہل چلاتے ہوں۔ دکانوں پر بیٹھ کر صبح سے شام تک محنت کی ہو، دفتروں میں کام کیا ہو، کسی چلائی ہو، اینٹیں ڈھوئی ہوں لیکن یہ کہ جو کچھ ملے اسے اللہ کا فضل سمجھو۔ اسے اپنی محنت کا ثمرہ کبھی نہ سمجھنا۔ بلکہ یہ جان لو کہ یہ اللہ کی دین ہے اس کی عطا ہے۔ اگر یہ تصور ہو گا تو انسان کا ذہن بالکل ایک دوسرے رُخ پر پروان چڑھے گا۔ اور اگر انسان یہ سمجھے گا کہ یہ میری کمائی ہوئی چیز ہے، میری محنت کا حاصل ہے۔ تو اب ظاہر بات ہے کہ وہ اس پر تصرّف کا اختیار بھی کُل کا کُل اپنے لئے چاہے گا اور چاہے گا کہ میں اسے کلیتاً اپنی مرضی سے صرف کروں۔ یہاں ایک اور کردار بھی سامنے آتا ہے۔ کچھ غافل لوگ جیسا کہ ہمارے ہاں بھی نظر آجائیں گے جو اس دنیا کی زندگی پر ریجھ جاتے ہیں اور یہیں کے عیش و آرام کے طالب ہوتے ہیں تو دولت مندوں کو دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ کبھی کبھی ان کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ
اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (۷۹)

"کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملا ہوتا۔ اتنی دولت ہمارے پاس بھی ہوتی جتنی قارون کو ملی ہے۔ وہ بڑے نصیبے والا ہے"۔ یہاں ذرا Compare

کیجیے، تقابل کیجیے "حظِ عظیم" کی ترکیب کو ہم اس سے پہلے سورہ حٰمٓ السجدہ میں پڑھ آئے ہیں - قرآن کے نزدیک حظ عظیم کیا ہے؟ یہ کہ ایک مومن میں برائی کو بھلائی سے دفع کرنے کی خصلت پیدا ہو - وہ دوسروں کے ظلم و جور پر صبر کرے اور ان کے لئے خیر کا طلب گار رہے - اور عام دنیا داروں کے نزدیک بڑا نصیبا کس چیز کا مظہر ہے، دولتِ دنیا کا - ؟ لیکن جب اللہ کا عذاب آیا - اللہ نے قارون کو اس کے محل سمیت اور اسکی کل دولت سمیت زمین میں دھنسا دیا - تو پھر وہی لوگ تھے کہ جنہوں نے یہ الفاظ کہے -

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ط (۸۲)

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس قارون جیسی دولت نہ تھی - اگر ایسا ہوتا تو کہیں ہم بھی زمین میں دھنسا نہ دیئے گئے ہوتے - یہ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہم پر ہوا کہ ہمارے پاس قارون جتنی دولت نہ تھی -

اس کے علاوہ اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما کر دو اہم باتیں ارشاد فرمائی گئیں - پہلی یہ کہ :

اے نبیؐ! یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں، سے ہدایت ہو جائے یہ تو اللہ ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے - وہی جانتا ہے اسی کا علم سب پر محیط ہے -

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ج (۵۶)

اے نبیؐ! آپ کے اختیار میں نہیں ہے کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت دے دیں یہ تو اللہ ہی کا اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کے لئے قبول فرما لیتا ہے اور دوسری بات یہ کہ :

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ط (۸۵)

گھبرائیے نہیں! وہ ہستی جس نے آپؐ پر قرآن کی ذمہ داری عائد کی ہے -

اسکی تبلیغ کا فرض منصبی آپؐ کے کاندھے پر رکھا ہے، وہ آپؐ کا ساتھ چھوڑنے والی نہیں ہے۔ وہ آپؐ کو ایک عظیم انجام کی طرف لوٹاتے گی۔ وہ انجام کہ جس سے بہتر کسی انجام کا تصور ممکن نہیں۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم
ونفعنى وايّاكم بالآيات والذكر الحكيم

رفقاءِ تنظیم کے لئے ایک خوش کن خبر!

امیر تنظیم اسلامی۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنے دروس میں اکثر شیخ الہندؒ کے ترجمے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور گاہے بگاہے رفقاء کو اس کے مطالعے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

رفقاء کی سہولت کے لئے ادارے نے، قرآن کے وہ نسخے جن میں شیخ الہند کا ترجمہ اور علامہ عثمانی کے حواشی شامل ہیں، ایک محدود تعداد میں منگوائے ہیں۔ کراچی میں یہ نسخہ ۱۰۰/- روپے سے زائد قیمت پر دستیاب ہے جبکہ قارئین حکمت قرآن کیلئے یہ نسخہ ۹۰/- روپے میں ہدیہ کیا جائے گا۔ (علاوہ محصول ڈاک)

آفسٹ کاغذ، عمدہ طباعت اور پلاسٹک کا جزدان اس نسخے کی اہم خصوصیات ہیں۔ (میثاق کے پتے پر حاصل کیجئے)

خصوصیاتِ قرآنِ حکیم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم)

کوئی شخص ایک نشست میں قرآن حکیم کی تمام خصوصیات بیان نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے کم از کم چھ تقاریر لازمی ہیں۔

میں اس نشست میں چند خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ قرآن حکیم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے علاوہ دنیا کی کسی مذہبی یا الہامی کتاب کی اصلیت (Genuineness) یقینی اور بااعتبار ہونا (Authenticity) اور درستی راستی صحت تمامیت (Integrity) ثابت نہیں کی جاسکتی یعنی ۱۔ نقلی یا جعلی نہیں ہے۔ ۲۔ قابل اعتبار و اعتماد ہے۔ ۳۔ مکمل ہے ناقص نہیں ہے۔ درحقیقت یہ وہی کتاب ہے جو آپؐ نے دنیا کو دی تھی۔ اس معاملے میں قول فیصل یہ ہے کہ ان تینوں خوبیوں پر غیر مسلموں نے گواہی دی ہے۔ (1- Muir, 2- T. P. Hughes, 3- Von Kreamer)

۲۔ جناب مسیح نے اپنے شاگردوں یا پیروؤں کو کوئی کتاب نہیں دی۔ اسی لیے ان کے صعود کے بعد ۱۳۳ اناجیل لکھی گئیں۔ دعا کی گئی کہ اصلی اوپر رہ جائیں نقلی نیچے گر پڑیں۔ ایک ہزار سال تک مذہبی مجالس منعقد ہوتی رہیں کہ ان کی اصلی تعلیم کیا تھی۔

۳۔ جب Nabucadnazar نے یروشلم کو تباہ کیا تو اصلی توریت بھی جل گئی۔ عزرا (عزیر) نے لکھی۔ وہ نیرو کے عہد میں جلادی گئی۔

۴۔ جناب بدھ نے کوئی کتاب نہیں دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پیروؤں نے ان کے اقوال قلمبند کیے۔ ان کی صحت کے بارے میں ایک ہزار سال تک مذہبی مجالس منعقد ہوتی رہیں۔ لیکن یقین حاصل نہ ہوسکا۔

۵۔ زرتشت کی کتاب ژند زبان میں تھی۔ زبان اور کتاب دونوں معدوم شدند۔

۶۔ جین دھرم کے بانی مہاویر نے کوئی کتاب نہیں دی۔ دونوں فرقوں کے پاس مختلف

کتابیں ہیں۔ مہاویر بھی گوتم بدھ کی طرح خدا کا منکر تھا۔ مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ بودھی اور جینی دونوں اپنے اپنے پیشوا کو خدا مانتے ہیں اور ان کے بتوں کو سجدہ کرتے ہیں۔

۲۔۔۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن نے پہلی ہی وحی میں فلسفے کے دونوں بنیادی مسائل کا حل پیش کر دیا۔ (ا) وجود کا منبع کیا ہے؟ (ب) علم کا منبع کیا ہے؟

۳۔۔۔ قرآن، مذہب کی تاریخ میں پہلی اور آخری کتاب ہے جس نے دین کو روایات، معجزات، کرامات، خوارق عادات اور ظنیات کے بجائے تجربے، مشاہدے، تدبر، تفکر، تعقل اور تفقہ یعنی برہان پر مبنی کیا۔

قرآن سے پہلے کسی الہامی کتاب نے یہ نہیں کہا۔

(۱) هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ط

(۲) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط

(۳) وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳-۲۸)

حقیقت تو یہ ہے کہ ظن، حق کے سامنے بالکل بکار آمد نہیں ہے۔

(۴) إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ

قرآن اپنے آپ کو خود برہان قرار دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ

۴۔۔۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا کی دریافت اور اشاعت سے پہلے قرآن نے لفظ رب کے ذریعے سے اس نظریے کو پیش کر دیا۔ رب کے معنی ہیں: —

The Creator, the Controller, The Sustainer and the Evolver of the Universe

۵۔۔۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ہستئ باری پر قرآن کے علاوہ دنیا کی کسی الہامی یا مذہبی کتاب نے دلائل پیش نہیں کیے ہیں۔ حکماء نے جس قدر دلائل مرتب کیے ہیں وہ بھی قرآن میں ہیں اور ایک دلیل قرآن نے پیش گوئی کے ذریعے سے دی ہے۔

Ontological, Cosmological, Teleological, moral argument from Prophecy.

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّومُ ۙ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ

فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ط

"قریب کے ملک یعنی فارس میں رومی (جو عیسائی ہیں) اہل ایران سے (جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب ہونے کے پیچھے عنقریب چند سال (نو سال) کے اندر، پھر اہل فارس پر غالب آجائیں گے۔"

یہ پیش گوئی دلیل ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کے پاس دونوں سلطنتوں کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

۶۔۔۔ قرآن کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے۔ کیونکہ وہ اس کا پیغام آخری ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ط

۷۔۔۔ ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے منطق اور فلسفے کی اصطلاحات کے بغیر، منطقی دلائل دیے ہیں۔ اگر وہ مصطلحات استعمال کرتا تو اس پر دو اعتراضات وارد ہو جاتے۔ (۱) یہ کتاب سب کے لیے نہیں ہے (۲) آپؐ نے کسی منطقی اور فلسفی کی شاگردی اختیار کی ہے یا اس سے استفاضہ کیا ہے۔ قرآن نے لفظ "حصر عقلی" استعمال کیے بغیر اس دلیل سے اتمام حجت کیا ہے۔

(طور - ۵۲-۳۵) اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ط

آیا ایشاں آفریدہ می شدند بغیر آفریندہ یا ایشاں خود آفریدگار اند؟

اسی لیے قرآن نے واجب، ممکن، حادث، قدیم، ممتنع، عدم اور وجود وغیرہم الفاظ استعمال نہیں کیے۔ عشق اور عاشق بھی نہیں کیے۔ عشق کی جگہ "حُب" استعمال کیا ہے۔

۸۔۔۔ آٹھویں خصوصیت۔ قرآن کے علاوہ کسی الہامی کتاب نے بنی آدم کو اپنا مخاطب نہیں بنایا۔ خاص قوم یا قبیلے کو مخاطب بنایا ہے۔

۹۔۔۔ نویں خصوصیت یہ ہے کہ کسی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں ہر زمانے میں بنی آدم کے لیے ہدایت رہوں گی۔ اور میری تعلیمات کبھی Out of date نہیں ہوں گی۔ اور میں بنی آدم کو کبھی مایوس نہیں کروں گی۔

۱۰۔۔۔ قرآن کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی کتاب تاریخ نسل انسانی پر اس قدر اثر انداز نہیں ہوئی۔

۱۱ــــ اس کے علاوہ کسی کتاب نے عالمگیر ہدایت ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔
۱۲ــــ اس کے علاوہ کسی کتاب نے بنی آدم کی زندگی میں اس قدر عظیم اور دور رس انقلاب برپا نہیں کیا۔ ایم این رائے کا قول لائق غور ہے جیوانوں کو انسان اور انسانوں کو فرشتہ رحمت بنا دیا۔
۱۳ــــ اس کے علاوہ کسی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تمہارا دین کامل کر دیا اور نعمت تمام کر دی۔
۱۴ــــ قرآن نے پہلی مرتبہ دنیا کو حریت، اخوت اور مساوات کا درس دیا۔
۱۵ــــ علم اور تعلیم کی اہمیت واضح کی، علم کو عام کیا، حصول علم کو لازمی قرار دیا۔
۱۶ــــ مذہبی رواداری کا درس دیا۔
۱۷ــــ عورت کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ ہندو دھرم، جین دھرم، بودھ دھرم، پارسی مذہب، مجوسیت، یہودیت اور عیسائیت نے عورت کو ذلیل، کمتر، فرومایہ اور دوزخ کا دروازہ قرار دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ الجنۃ تحت اقدام الامہات۔ روحانی طور پر مرد کی برابر ہے۔
۱۸ــــ رنگ، نسل، زبان، قوم، قبیلہ، ذات پات کے بتوں کو توڑ دیا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔
۱۹ــــ قرآن نے پہلی مرتبہ رہبانیت اور ترک دنیا کی مذمت کی اور اسے خلاف فطرت انسانی قرار دیا۔ وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا الخ
۲۰ــــ بدھ دھرم نے کہا "سروم دکھم" پوری زندگی دکھ ہے۔ قرآن نے کہا غلط ہے پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس لیے مبارک ہے اور توشہ آخرت ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کا زاویہ نگاہ Pessimistic تھا۔ قرآن نے ذہنیت میں انقلاب برپا کیا اور Meliorism کی تعلیم دی۔
۲۱ــــ قرآن نے آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے فولاد کی اہمیت واضح کی۔ جس کی صداقت پر عصر حاضر گواہ ہے۔
۲۲ــــ قرآن پہلی مذہبی الہامی کتاب ہے جس نے انسان کو حصول علم کا حکم دیا۔ کیونکہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔
۲۳ــــ ..... جس نے کائنات کا مطالعہ اور مظاہر فطرت میں غور کی دعوت دی۔ تاکہ

اللہ پر ایمان پختہ ہو سکے اور اس مشاہدے کی بدولت سائنس عالم وجود میں آیا اور مسلمان سائنس کے علمبردار بن گئے۔

۲۴۔ قرآن نے یورپ کی Dark age کا خاتمہ کر دیا۔
نے چھٹی صدی عیسوی میں فلسفے کی تعلیم بند کر دی تھی۔ قرآن نے ساتویں صدی میں فلسفے کی شمع از سر نو روشن کی جس کی بدولت یورپ میں احیاء العلوم اور اصلاح کلیسا جیسی انقلاب آفریں تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اسی لیے پوپ نے لوتھر کو "نصف مسلمان" قرار دے کر عیسائیت سے خارج کیا تھا۔

۲۵۔ قرآن کی بدولت یورپ نے انیسویں صدی میں عورت کو طلاق حاصل کرنے کی اجازت دی۔ عیسائی مذہب میں طلاق نہیں ہے۔

۲۶۔ قرآن نے پہلی مرتبہ اعلان کیا۔ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ"

۲۷۔ قرآن نے پہلی مرتبہ اقوام کو توحید پر مجتمع ہو جانے کی دعوت دی تاکہ امن قائم ہو سکے۔

۲۸۔ قرآن نے پہلی مرتبہ فرقہ بندی کو شرک قرار دیا۔

۲۹۔ قرآن پہلی مذہبی کتاب ہے جس نے یہ چیلنج دیا کہ اگر تمہیں اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے تو کم از کم ایک سورت بنا کر دکھا دو۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۳۰۔ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے دین اور دنیا، دنیادار اور دین دار، چرچ اور اسٹیٹ ..... مادہ اور نفس ناطقہ کی دوئی کو ختم کر دیا۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ سیاست کیا ہے؟ مذہب کے عقیدۂ توحید کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کر دینے کا دوسرا نام ہے۔

۳۱۔ قرآن کی بدولت، دنیا INDUCTIVE LOGIC سے آگاہ ہوئی۔ قرآن سے پہلے دنیا صرف ارسطو کی DEDUCTIVE LOGIC سے آشنا تھی۔ قرآن نے کائنات میں غور و فکر اور مظاہر کے مشاہدے کی دعوت دے کر استقراء کا قانون واضح کر دیا۔

۳۲۔ قرآن نے پہلی مرتبہ دنیا کو Ethical Ideal Plus Polity عطا کی۔ قرآن ایک خوشگوار امتزاج ہے دین اور دنیا کا، درویشی اور سیاست یا حکومت کا۔

۳۳۔ قرآن نے رسم پرستی (Ritualism) کو ختم کر دیا۔ پادری نہ ہو تو عیسائی عبادت نہیں کر سکتا۔ پنڈت نہ ہو تو ہندو عبادت نہیں کر سکتا۔ موبد نہ ہو تو مجوسی عبادت نہیں کر سکتا۔ ربی نہ ہو تو یہودی عبادت نہیں کر سکتا۔ مسلمان کسی کا محتاج نہیں ہے قرآن نے انسان کو انسان کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا۔

۳۴۔ دنیا کے اکثر و بیشتر مذاہب کے بانی خود بھی لکھے پڑھے تھے اور ان کی قوم بھی تعلیمیافتہ اور متمدن تھی مثلاً (۱) ہندوؤں کے رشی اور فلسفی، (۲) گوتم بدھ اور اس کی قوم، (۳) مہاویر اور اس کی قوم، (۴) حکیم زرتشت اور اس کی قوم (۵) حضرت موسیٰ اور ان کی قوم، (۶) حضرت عیسیٰ اور ان کی قوم۔ ہندوستان اور ایران تو فلسفے اور حکمت کا گھر تھے۔

لیکن نہ آنحضرتؐ خواندہ تھے نہ آپؐ کی قوم۔ بلکہ عرب تو جہالت میں ضرب المثل تھے۔ اور تہذیب و تمدن سے بیگانہ۔ تو قرآن کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک اُمّی کے قلب پر نازل ہوا اور اس نے جاہل قوم کو عالم اور علم کا علمبردار بنا دیا۔

۳۵۔ قرآن کریم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دنیا کی تمام الہامی کتابوں میں یہی ایک کتاب ہے جو سفینوں کے علاوہ سینوں میں بھی محفوظ ہے۔

اور یہی ایک ایسی الہامی کتاب ہے جس کے متن کی صحت کی گواہی اغیار نے دی ہے۔ ورنہ ہر الہامی کتاب یا گم ہو چکی ہے یا اس کے متن میں لفظی اور معنوی تحریف ہو چکی ہے۔ اور صرف اسی کا نسخہ (مصحف عثمانی) آج بھی محفوظ ہے۔ کسی الہامی کتاب کا اصلی نسخہ نہ محفوظ ہے۔ نہ موجود ہے۔

سچ کہا ہے اقبال نے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ! ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود ! جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود !

اور تاریخ عالم گواہ ہے کہ کسی کتاب نے قرآن سے بڑھ کر انقلاب پیدا نہیں کیا اور کوئی ہادی یا بانی مذہب یا رسول آنحضرت سے بڑھ کر کامیاب نہیں ہوا۔

۳۶ ویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں ..... کوئی بات تہذیب اور حیا کے معیار سے فروتر نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرد اس کتاب کو عورتوں کے مجمع میں بھی پڑھ کر انہیں سمجھا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ کسی پنڈت سے پوچھیں کہ کیا تم اس منتر کا اردو ترجمہ عورتوں کو سنا سکتے ہو جو تم نکاح کے وقت پڑھتے ہو، تو اس کا رنگ فق ہو جائے گا۔ وہ منتر یہ ہے اَتھروَن وید کانڈ نمبر ۱۴ سوکت نمبر ۲ منتر نمبر ۳۸۔

۳۷ ویں خصوصیت قرآن نے تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ سرمایہ داری کے خلاف تعلیم دی ہے۔

۳۸ ویں خصوصیت ۔ قرآن نے قانون وراثت نافذ کیا۔

۳۹ ویں خصوصیت ۔ انفرادی ذمہ داری کی تعلیم دی۔

۴۰ ویں خصوصیت ۔ قرآن نے تمام مذاہب کے غلط عقائد کی تردید کر دی۔ اس کا یہی ایک کارنامہ اسے غیر فانی بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

۴۱ ویں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔

۴۲ ویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنا تعارف خود کراتی ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ..... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

۴۳ ویں خصوصیت ۔ یہ کتاب انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کی یکساں آبیاری کرتی ہے۔

۴۴ ویں خصوصیت ۔ اس کتاب نے شراب، قمار اور سود تینوں کو حرام قرار دے کر دنیا کو لعنت سرگانہ سے نجات دی۔

۴۵ ویں خصوصیت ۔ قرآن نے دنیا کے تمام بانیان مذاہب کی عزت کرنے کا حکم دیا تاکہ رواداری اور مصالحت کا جذبہ پیدا ہو سکے۔

۴۶ ویں خصوصیت ۔ وحدت ادیانِ عالم کی تعلیم دی۔ وحدت نسل انسانی کی تعلیم دی۔ وحدت معبود کی تعلیم دی۔ دین ابتداء سے ایک ہی رہا۔ اللہ کی عبادت کرو۔ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔

۴۷ ویں خصوصیت ۔ انسان گنہگار یا ناپاک نہیں ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔

۴۸ ویں خصوصیت ۔ صرف یہ کتاب ہے جس کو اس کے پیش کرنے والے نے اپنی

زندگی میں اپنے پیروؤں کو دے دیا۔ اور وہ آج تک بجنسہٖ محفوظ ہے۔

۴۹ ویں خصوصیت۔ قرآن سے بڑھ کر شرک کی تردید اور توحید کا اثبات کسی مذہب نے نہیں کیا۔

۵۰ ویں خصوصیت۔ حاملِ وحی کو بطور اسوۂ حسنہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۵۱ عقیدۂ توحید کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا یعنی شرک کی ہر ممکن صورت کی تردید کر دی۔ مثلاً (۱) شرک فی الذات۔ (۲) شرک فی الصفات، (۳) شرک فی العبادۃ، (۴) شرک فی الاستعانۃ، (۵) شرک فی التصرف، (۶) شرک فی الحکم، (۷) شرک فی الامر۔

۵۲ ویں خصوصیت ما سوی اللہ، فقیر الی اللہ ہے۔ صرف اللہ غنی اور حمید ہے۔

(بقیہ درجۂ حکمت)

ایک حد ہے کہ اس کے بعد اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا ہے ورنہ شعور و خواہش کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے جس طرح لوہے کے ٹکڑے میں خارجی مقناطیسی میدان کے ذریعہ لوہائی مقناطیسیت پیدا کرنے میں ایک حد ایسی آتی ہے۔ کہ پیدا شدہ مقناطیسیت میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا خواہ خارجی مقناطیسی میدان میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کر دیا جائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ نورانی قوت آخری حد تک پہنچا دی گئی تھی کہ اب اس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہ تھی۔ ورنہ بصورت دیگر جامۂ بشریت تار تار ہو کر مقصدِ نبوت فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ (جاری ہے)

علامہ سید سلیمان ندوی — ایک عظیم مبصرِ قرآن

— ڈاکٹر غلام محمد

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی مؤرخانہ دھاک اور ادیبانہ ساکھ، اُن کی متکلمانہ، محدثانہ اور سب سے بڑھ کر قرآنی بصیرت کا حجاب اکبر بن گئی، لامحالہ عام [redacted] علامہ کے اسی ظاہری اور ثانوی پہلو کی داد و تحسین ہوتی رہی، علامہ کو گلہ رہا کہ ع از درونِ من نہ جست اسرارِ من

فرمایا کرتے تھے کہ "تاریخ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے، ہمارے ہاں اصل غذا تو قرآن پاک ہی کی فراہم کی جاتی ہے، ہمارے استاد علامہ شبلی نعمانی نے تقاضائے وقت کو پہچان کر تاریخ کی آڑ میں مسلمانوں تک اسلام کی صحیح تعلیمات پہنچانے کا ارادہ فرمایا تھا" — واقعی بات بھی یہی ہے کہ جو لٹریچر علامہ شبلی اور علامہ سلیمان نے چھوڑا ہے اُس سے علامہ ندوی کے اس قول کی کھلی تصدیقات حاصل ہوتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس پہلو سے شاگرد کا ترکہ استاد کے ورثہ سے کہیں زیادہ گرانقدر، معتبر اور مستند ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے بھی لکھا ہے کہ "سید صاحب اپنے علم و تحقیق اور وسعت مطالعہ میں اپنے استاد و مربی مولانا شبلی مرحوم سے بہت آگے بڑھ گئے تھے"[1] ہو سکتا ہے کہ یہ فرق وسعت علمی اور وقت نظر کے ساتھ ساتھ شاکلہ اور مزاج کے فرق کی وجہ سے بھی پیدا ہو گیا ہو، حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ جب ہمارے حضرت علامہؒ کی تصنیفات سے

---

[1] پرانے چراغ جلد اول۔ "مولانا سید سلیمان ندویؒ"

متعارف ہوئے تو حضرت ممدوح کا یہ بلیغ جملہ اہل علم میں مشہور و مقبول ہو گیا تھا کہ:

”شبلی و سلیمان میں وہی نسبت ہے جو ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم میں ہے“

آج یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ تحقیقات علمی، خصوصاً حکمت قرآنی میں جو اعتبار اور رتبہ استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ کے رشحات قلم کو حاصل ہے اور بیک وقت دیوبند، فرنگی محل اور عالم استشراق میں اسکی ساکھ قائم ہے، وہ علامہ شبلی کے حصہ میں نہ آسکی، محدث جلیل مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اپنے عظیم المرتبت استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ”عقیدۃ الاسلام“ کا ایک نسخہ جو انکی ملک میں تھا، راقم الحروف کو دکھایا تھا، اس میں سات آٹھ مقامات پر عربی زبان میں علامہ کشمیری کے قلمی حواشی اس مفہوم کے ثبت ہیں کہ ”صاحب ارض القرآن نے اس مقام پر تحقیق ختم فرما دی ہے“ - اسی طرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گرانقدر تفسیری حواشی میں کئی جگہ ارض القرآن سے جو استناد فرمایا ہے، وہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے — خیر یہ تو ایک ارض القرآن کی بات آگئی، ”عربوں کی جہاز رانی“ اور ”عرب و ہند کے تعلقات“ تو بظاہر ٹھیٹھ جغرافیائی اور تاریخی کتابیں ہیں جو علامہ کی قلمی یادگار ہیں، مگر ان کتابوں کو بھی پڑھیئے تو ان کے اندر تاریخ و جغرافیہ سے زیادہ قرآن پاک ہی کا تعارف (INTRODUCTION) ملے گا اور پڑھنے والے میں قرآن سے رشد و ہدایت حاصل کرنے ہی کا ذہنی رجحان نشو و نما پائے گا — رہی ”سیرت النبیؐ“، تو اس کے متعلق حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ جیسے وسیع النظر عبقری عالم فرمایا کرتے تھے کہ ”سیرت النبیؐ“ در اصل انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہے اور اس [illegible] علمی کمالات کھپا دیئے ہیں [illegible] سے [illegible] کہ سیرت کو انسائیکلوپیڈیا بنا دیا [illegible] علامہ سید سلیمان کے قلم کی یادگار ہیں اور

ان میں حکمتِ قرآنی کے جوہر، خاص طور پر اہل نظر کے لئے جاذب توجہ ہیں ۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں راقم الحروف دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاضر تھا تو فاضل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مجھ سے فرمایا "میرے روابط تو ہندوستان اور بیرون ہند سارے ہی مکاتیب خیال کے علماء سے ہیں، مگر میں نے قرآنی مباحث پر حضرت سید صاحبؒ زیادہ غامض نظر کوئی نہیں پایا"

پھر اپنے قلم سے یہی شہادت ان الفاظ میں پیش فرمائے ہیں کہ :

"۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ہندوستان و بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلہ میں ۔ ۔ ۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا" [۱]

اعتراف کمال فرماتے ہوئے آگے صراحت فرماتے ہیں :۔

"عام طور پر لوگ سید صاحب کو مورخ یا ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں خصوصاً علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے، میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید اور علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا" [۲]

یہی اعتراف مولانا محمد اویس نگرامی رحمۃ اللہ علیہ (سابق شیخ التفسیر ندوۃ العلماء) کو رہا جو حضرت علامہ کے قرآنی علوم کے وارث تھے، مولانا فرمایا کرتے تھے اور راقم ناچیز نے بھی دس سالہ تعلق میں یہی دیکھا کہ حضرت علامہ کی عام بات چیت حتیٰ کہ مزاح تک قرآنی اشارات و نکات سے مملو رہتا تھا، نمونہ کے لئے مولانا نگرامی کی ایک روایت پیش ہے۔ مولانا نے اپنے استاد عالی مقام سے عرض کیا کہ کچھ لوگوں نے ریڈیو سیٹ کے لئے ایک غلاف تیار کیا ہے اور اس پر کوئی آیت کاڑھنا چاہتی ہیں، حضرت علامہ نے جھٹ سے فرمایا۔ أَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (فصلت) یعنی ہمیں اسی خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے — آپنے لطافت شاید محسوس نہ کی ہو، یہ قول ہوگا قیامت کے دن انسان کا نہیں بلکہ اسکے جسم کی بے زبان کھال کا اور

[۱] و [۲] بحوالہ سابق ۔ صفحات ۵۷، ۵۸

کھال کے بول پڑنے پر خود جسم و زبان والے پوچھیں گے کہ تم بے زبانوں کو آج کس نے گویا کر دیا ہے تو وہ جلدیں کہیں گی کہ اسی خدا نے جس نے سب کو گویائی بخشی۔ سبحان اللہ کیا استحضار ہے اور کیا موزونیتِ انتخاب،

یہ چند تصدیقات ان حضرات کے لئے پیش کی گئیں جو حضرت علامہ سے شخصی طور پر یا ان کی تصنیفات کے غائر مطالعہ کے ذریعہ ان سے متعارف نہیں ورنہ جو عظیم الشان علمی ورثہ وہ اُمّتِ محمدیہ کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ ہر تحسین و تصدیق غیر سے بے نیاز ہے

ے طمع فاتحہ از غیر نداریم نیاز عشقم اندر پس من فاتحہ خوانم باقیست

حضرت علامہ خالص علمی و تحقیقی مزاج اور متین و متوازن طبیعت کے مالک تھے، پھر اس پر نورِ باطنی مستزاد تھا جس سے کلامِ الٰہی کے اسرار کھلتے ہیں۔ علامہ نے اپنی علمی تحقیقات کی جواں عمری میں یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ ایک کنویں کے کنارے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے پانی سینچ رہے ہیں یہ ابن عباس کون ہیں ہ جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعا دی تھی۔ اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْقُرْاٰن (اے اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرما) حضرت علامہ کا اُن کے ساتھ کھڑے پانی سینچنا کھلی بشارت ہے کہ انہیں قرآنی علوم و حکم سے خاص مناسبت بخش دی گئی اور ان کے ہاتھوں یہ معارف وقفِ عام ہوں گے۔

ع یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مِل گیا

اس ضروری تمہید کے بعد اب حضرت علامہ کی تصانیف سے یہ ہیچمیرز و ہیچمدان حکمتِ سلیمانی کے چند نظائر پیش کرتا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ قرآنی عقدے کیسے کھلتے ہیں اور ایک متجسّس ذہن کو کیسا سکون و سرور میسرآتا ہے۔

(۱) نامتناہی اجر اور خُلقِ محمدی میں ربط

سورۂ قلم کی ابتدائی آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "خلقِ عظیم" کا جہاں ذکر ہے وہاں دو قرآنی جواہر پارے یہ ملتے ہیں (۱) وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (۲) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یعنی اے محمدؐ (۱)، آپ کا اجر کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور (۲)، تحقیق کہ آپ اعلیٰ اخلاق پر فائز ہیں ـــ یہاں الجھن یہ پیش آتی ہے کہ نامتناہی اجر اور خلقِ محمدی کا

کا معنوی ربط کیا ہے؟ سنئے! اپنی بے نظیر کتاب "خطباتِ مدراس" کے چھٹے خطبہ "عملیت" میں حضرت علامہ اسکی گرہ کشائی فرماتے ہیں :

"یہ دونوں فقرے گو نحو میں معطوف و معطوف علیہ ہیں لیکن درحقیقت اپنے اشارۃ النص اور ترکیبِ کلام کے لحاظ سے علت و معلول ہیں یعنی دعوے اور دلیل ہیں، پہلے ٹکڑے میں آپ کے اجر کے نہ ختم ہونے کا دعوے ہے اور دوسرے ٹکڑے میں آپکے عمل اور اخلاق کو دلیل میں پیش کیا گیا ہے یعنی آپ کے اعمال اور آپ کے اخلاق تو دلیل ہیں کہ آپ کے اجر کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا"

(۲) اہلِ جنت کا صبح وشام کا رزق کیا ہے؟

سورۃ مریم میں ایک جگہ جنتیوں کو صبح وشام رزق ملنے کا ذکر ہے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا — یہ رزق کیا ہوگا؟ اس کی حقیقت کو حضرت علامہ نے سیرت النبی جلد چہارم میں "جنت مقامِ تسبیح و تہلیل" کے زیرِ عنوان بے نقاب فرمایا ہے :

"اس صبح وشام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے الوان نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح وشام کی کیا تخصیص تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہونگے میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح وتہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا: یُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (صفۃ الجنۃ) وہ صبح وشام اللہ کی تسبیح وتہلیل کریں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اہلِ جنت کو (ان) کی تسبیح وتہلیل کا الہام ہوگا جیسے کہ [illegible] اور شاید قرآن پاک کی اس [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(۳) بہ مشکل قدرت پر روزہ کی فرضیت ساقط

سورۂ بقرہ کی مشہور آیت ہے

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ - یہاں "یطیقون" کے لفظ کا عام طور پر مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ جب روزہ رکھنے کی سکت ہی باقی نہ رہے تو روزہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے اور اسکی تلافی ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلا کر کی جا سکتی ہے - حضرت علامہ نے یہ عقدہ کشائی فرمائی کہ یہاں طاقت اور سکت کے بالکل ہی زائل ہو جانے کا ذکر نہیں بلکہ محض بہ دقت روزہ رکھنے کی صورت میں رخصت حاصل ہے، دقیقہ رسی ملاحظہ ہو -

"لفظ اِطَاقَة کے معنی میں بعض صاحبوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ اسکے معنے توانائی، وسعت اور قدرت کے ہیں، بہ مشکل قدرت اور طاقت رکھنے کے نہیں - مگر یہ صحیح نہیں - اِطَاقَة طاقة کے باب افعال سے مصدر ہے، اس کا ثلاثی مصدر کم استعمال میں آتا ہے اور طاقة کے لغوی معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں -

والطوق الطاقة اى	طوق کے معنی طاقت کے ہیں -
اقصى غايته وهو اسم	یعنی قوت کی انتہائی غایت اور
لمقدار ما يمكن ان	وہ اس مقدار کا نام ہے جس
يفعله بمشقة منه	کو کوئی مشقت کے ساتھ کر سکے -

حضرت ابن عباسؓ غالباً یہی معنی قرار دیکر حاملہ، مرضعہ اور بوڑھے کو فرضیت سے مستثنیٰ سمجھتے تھے (ابو داؤد - کتاب الصوم - باب من قال هى مثبتة للشيخ والحبلى)

یہ تفسیر کا جواہر پارہ سیرت النبیؐ جلد پنجم میں روزہ کے زیر عنوان [illegible] آکر مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی محمد حسن امرتسری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ سے جب حضرت علامہ نے [illegible] کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

(۴) قرآن میں ختم نبوت کا مفہوم

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کا لقب عطا کیا گیا ہے، زمانۂ حاضر کے بعض مدعیوں نے لفظ خاتم کی وہ تعبیر اختیار کی جس سے لفظی طور پر تو یہ لقب محمد عربی (فداہ ابی وامی) صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ خاص ہے باقی نبوت کا دروازہ کھلا کا کھلا رہ جائے اور ہر بیباک و گستاخ حریم نبوت میں بار پا سکے، اس کے جواب میں علمائے حق نے دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں اور قرآن، حدیث اور اثر سے مدعیان نبوت کے رد میں مسکت جوابات دیئے ہیں۔ اس ذخیرہ کا بڑا حصہ راقم سطور کی نگاہ میں ہے [1]۔ اور اس علم و اطلاع کے ساتھ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ قرآنی استدلال جو حضرت علامہ سید سلیمان نور اللہ مرقدہٗ نے ایک صفحہ میں پیش فرمایا ہے وہ بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے اور طویل طویل کتابیں اس استدلال سے خالی ہیں — سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد میں خصائص نبوی کے زیر عنوان حضرت علامہ کی نرم و نازک انگلیوں سے کیا پر زور اور کامیاب علمی محاربہ آ گیا ہے کہ کوئی مدعی اجرائے نبوت سر نہیں اٹھا سکتا، ملاحظہ ہو۔

"ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے، اسی سے اسکے دوسرے معنی کسی شے کو بند کر کے اس پر مہر کرنے کے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ اسکے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے اور چونکہ یہ عمل مُہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے اس کے معنی انتہا اور ختم کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ تمام معنے مستعمل ہوتے ہیں مثلاً — اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ (یٰسٓ) آج قیامت کے دن

---

[1] اس سلسلے کی سب سے مبسوط تالیف مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تین مجلدات ختم نبوت فی القرآن، ختم نبوت فی الحدیث اور ختم نبوت فی الآثار ہے۔

ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے (یعنی بند کر دیں گے کہ بول نہ سکیں گے)
یہاں ختم کے معنی بند کر دینے کے بالکل ظاہر ہیں -
خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (بقرہ) خدا نے (ان کافروں کے) دلوں پر مہر لگا دی ہے یعنی ان کے دلوں کے دروازے بند ہیں کہ باہر سے جو نصیحت اور ہدایت کی باتیں سنتے ہیں وہ ان کے دلوں کے اندر گھس نہیں سکتیں اور بے اثر رہتی ہیں -
وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ (جاثیہ) اور خدا نے اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی (یعنی اس کے کان اور دل بند کر دیئے) کہ اس کے کان کے اندر دعوت رسول کی آواز اور اس کے دل کے اندر اس آواز کا اثر نہیں جاتا -
یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ (مطففین) (اہل جنت) پلائے جائیں گے وہ شراب جس پر مہر لگی ہوگی وہ سربمہر یعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ خالص شراب ہے، یہ کھلی نہیں کہ اس کے اندر کی خوشبو باہر نکلی ہو اور نہ اسکے اندر باہر سے کوئی چیز کسی نے ملا دی ہے جس سے اسکی تیزی کم ہو گئی ہو اس کے بعد یہ آیت ہے -
خِتَامُہٗ مِسْکٌ - اسکی مہر مسک ہوگی — یا اس شراب کا آخر مسک ہوگا یعنی اسکے ہر گھونٹ کے بعد مشک کی بو اس میں سے نکلے گی یا یہ معنے کہ بوتل یا صراحی کا منہ نہایت صفائی اور نزاہت کی غرض سے دنیا کی طرح مٹی، لاکھ یا موم کے بجائے مشک خالص سے بند ہوگا -

"بہرحال ان تمام استعمالات سے بالیقین معلوم ہوگا کہ اس لفظ کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں - لفظ خاتم کی دو قرأتیں ہیں مشہور قرأت تو خَاتِم (بکسر تاء) کی ہے جسکے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہوئے اور دوسری قرأت خَاتَم (بفتح تاء) کی ہے جسکے معنی ہیں وہ شئے جس کے ذریعہ کوئی شئے بند کی جائے اور اس پر مہر لگائی جائے تاکہ وہ کھولی نہ جا سکے اور نہ اس کے اندر کوئی چیز باہر سے جا سکے - الغرض دونوں حالتوں میں آیت پاک کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود پیغمبروں کے سلسلے

کو بند کرنے والا اور اس پر مہر لگا دینے والا ہے کہ پھر آئندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہوسکے۔"

(۵) زکاۃ اور تملیک!

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ الخ ہمارے اکثر فقہائے نے مدات زکواۃ والی آیت میں فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ سے مراد صرف جہاد بالسیف لیا ہے اور لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو لام تملیک قرار دیا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک یہ تحدیدات درست نہیں۔ ان کے نزدیک فی سبیل اللہ میں ہر دینی کام شامل ہوسکتا ہے اور لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو لام انتفاع لیا جاسکتا ہے۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم میں اس مقام پر یہ بصیرت افروز حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے۔

"اکثر فقہائے نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گزر چکی لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، اس سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔ اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکواۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملک بنانا ضروری ہے مگر انکا استدلال جو لِلْفُقَرَآءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔"

علامہ کی اس تشریح کو قبول کر لیا جائے تو صرف زکواۃ کا دائرہ کتنا وسیع ہوجائے اور دوسری طرف "حیلۂ تملیک" کی صد درجہ مضحکہ خیز اور شرمناک گرم بازاری ختم ہو جائے

(۶) اظہار و غلبۂ دین اسلام

قرآن پاک میں ... تین مقامات ...

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ (توبہ)

[illegible]

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پیشگوئی پوری ہو چکی یا اس کا ہونا باقی ہے؟ عام رائے تو یہی ہے کہ فتح مکہ کی صورت میں یہ پیشین گوئی ظاہر و ثابت ہو چکی، بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ نہیں ہر دور میں اظہار دینی اور غلبۂ ظاہری کی ذمہ داری اُس دور کے مسلمانوں پر عائد کی گئی ہے۔ حضرت علامہ نے سیرۃ النبی کی ناتمام جلد ہفتم میں اس آیت پاک کی تشریح میں جو نکتہ آفرینی کی ہے وہ اہل نظر کو خاص دعوتِ فکر فراہم کرتی ہے۔ غور فرمائیں۔ علامہ فرماتے ہیں:۔

"یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح و سورۂ صف میں دُہرائی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے۔ یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اسکو دوسرے رنگ میں پورا ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث تو ہے۔ لیکن اسکے پورا ہونے کے لئے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے۔ بدر وغیرہ میں فتح کی پیشین گوئی کو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اسکی طرف اشارہ موجود ہے۔"

(۷) یہودیوں کی حکومت؟

مرض الموت میں سفیر شام، ان کے مشیر ثقافتی اور دو ایک اور عرب حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے مزاج پرسی کے بعد سفیر صاحب نے عرض کیا کہ ایک علمی الجھن ہے جو کئی علماء سے حل نہ ہو سکی وہ یہ ہے کہ یہودیوں کے متعلق تو قرآن پاک میں یہ تصریح موجود ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔	مے ماری گئی ان پر رسوائی اور فقیری۔

اور احادیث نبوی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کبھی یہ قوم دنیا میں باآبرو اور حکمران قوم نہیں رہے گی پھر آج فلسطین میں انکی حکومت کیسے قائم ہے؟

حضرت علامہ نے ایک لمحہ تامل کے بغیر فرمایا کہ اس کا جواب تو قرآن پاک ہی میں خود موجود ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ	ماری گئی ان پر ذلت جہاں کہیں
أَيْنَمَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ	بھی پائے جائیں گے بجز اس کے
اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ	کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رسی تھام
	لیں یا الناس کی رسی۔

اور اسکی تشریح میں فرمایا کہ حبل اللہ تو دین اسلام ہے اور حبل الناس سے مراد "ورلڈ پاور" یعنی عالمی طاقت ہے یعنی وہ دین میں داخل ہو جائیں یا کسی عالمی طاقت کا سہارا لے لیں تو البتہ ان کی ذلت دور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کی حکومت محض انگریز و امریکہ کے بل بوتہ پر قائم ہے!

اس جواب سے سفر شام تو خیر اچھل ہی پڑے تھے، مگر جب یہ نکتہ راقم کے قلم سے نکل کر اہل علم کی نگاہوں میں آیا تو حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے فرمایا کہ چودھا صدی میں یہ بات پہلی بار حضرت علامہ پر کھلی ہے اور حضرت مولانا دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسکی بڑی تحسین و آفرین فرمائی تھی کہ یہ سید صاحب ہی کا حصہ تھا، یہ نکتہ پہلی بار سمجھ میں آیا۔

سلیمانی بازارِ علم و حکمت میں سے پانچ ساتھ جواہر قرآنی یہاں اہل نظر کی نذر کئے گئے ہیں تاکہ ان کی آب و تاب کو دیکھ کر وہ خود اس بازار میں جا پہنچیں اور تزیین فکر و نظر کے اسباب مہیا کر سکیں۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

تفسیر موّاج کا اجمالی تعارف

پروفیسر محمد اسلم

تفسیر بحر مواج کے مصنف، ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی رحمۃ اللہ دکن کے مشہور تاریخی شہر دولت آباد میں آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کے خلیفہ اور جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلی علیہ الرحمہ کے دو نامور شاگردوں، مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر شریکی کی نگرانی میں ہوئی جب امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں برعظیم پاک و ہند پر حملہ کیا تو اس کے دہلی پہنچنے سے پہلے مولانا خواجگی اور مولانا شہاب الدین دولت آبادی دہلی سے مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔

مولانا خواجگی نے تو کالپی میں سکونت اختیار کی اور مولانا شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کا رخ اختیار کیا سلطان ابراہیم شرقی نے جونپور میں ان کا شاہانہ استقبال کیا اور انہیں ملک العلماء کا خطاب دے کر اپنی ریاست کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔

مؤرخ شہیر فرشتہ کی روایت ہے کہ شاہی دربار میں ان کی نقرئی کرسی شاہی تخت کے برابر لگائی جاتی تھی۔ ایک بار ملک العلماء شدید بیمار ہوئے تو سلطان ابراہیم ان کی عیادت کو گیا، اس موقع پر اس نے پانی کا ایک پیالہ ان پر تصدق کر کے پیا اور یہ دعا کی کہ اگر ان کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی عمر انہیں لگا دے۔

مولانا شہاب الدین کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انہوں نے کافیہ کی شرح، شرح الہندی کے عنوان سے تحریر کی۔ ان کی تحریر کردہ شرح اصول بزدوی کا ایک مخطوطہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔ علم الکلام کے موضوع پر ان کی تصنیف العقائد الاسلامیہ قرون وسطیٰ میں برعظیم پاک و ہند کے دینی حلقوں میں بڑی مقبول تھی۔ اس تصنیف کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے عربی نحو پر ان کی ایک تصنیف الارشاد کے عنوان سے حیدر آباد دکن سے طبع ہو چکی ہے۔ اسی طرح قصیدہ بانت سعاد کی شرح بھی حیدر آباد سے چھپ چکی ہے۔

مولانا شہاب الدین نے فتاوی کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، جو انہوں نے سلطان ابراہیم شرقی کے نام معنون کیا تھا۔ سلطان کے نام کی مناسبت سے یہ فتاوی ابراہیم شاہی کہلاتا ہے۔

مناقب السادات کے عنوان سے انہوں نے آل رسولؐ کے فضائل و حقوق پر ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا ذکر سٹوری نے اپنی تصنیف "پرشین لٹریچر" میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے تاریخ مدینہ منورہ بھی قلمبند کی تھی جس کے نسخے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے ان کی ایک تصنیف بدائع البیان کا ذکر بھی کیا ہے۔

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کی سب سے اہم تصنیف قرآن حکیم کی تفسیر ہے جو بحر مواج کے نام سے مشہور ہے۔ بدقسمتی سے یہ تفسیر ابھی تک اہل علم کی توجہ کا مرکز نہیں بنی۔ اس تفسیر کا ایک ضخیم مخطوطہ جو الحمد سے لے کر الکہف تک کی تفسیر پر مبنی ہے، انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے اور اس کی مائیکرو فلم میرے پاس موجود ہے۔

الکہف سے لے کر والناس تک کی تفسیر پر مبنی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ ان دونوں کو ملا کر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی ہے۔

سورۂ جن سے لے کر والناس تک کی تفسیر گذشتہ صدی کے اواخر میں چھپ گئی تھی۔ اور بعض کتاب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

تفسیر بحر مواج کی ضخامت اندازاً تین ہزار صفحات ہے۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں فارسی زبان میں اس سے زیادہ ضخیم تفسیر نہیں لکھی گئی۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا شمار برعظیم پاک و ہند کے اولین مفسرین میں ہوتا ہے۔ موصوف شیخ علی مہائمی صاحب تبصیر الرحمٰن کے ہم عصر ہیں۔

شیخ علی المہائمی شافعی المذہب تھے اور ان پر تصوف کا غلبہ تھا۔ جبکہ قاضی شہاب الدین حنفی المذہب تھے۔ اور صوفیہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود ان کی تفسیر میں تصوف کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ موصوف جار اللہ زمخشری کے بڑے مداح تھے۔ اور بحر مواج میں الکشاف کے حوالے برابر دیے چلے جاتے ہیں۔

قاضی شہاب الدین ہر سورۃ کی تفسیر کرنے سے پہلے اس کی آیتوں اور حرفوں کی تعداد بھی بتاتے ہیں۔ انہوں نے تفسیر کے آغاز میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اختلاف قرأت کے مسئلہ میں موصوف اہل مکہ و مدینہ کی پیروی کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن ان ہی دو شہروں میں نازل ہوا تھا۔ لہٰذا وہاں

کے باشندوں کی قرأت ہی مستند ہو گی اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی تھی۔ سورہ الفاتحہ کی تفسیر کے آغاز میں انہوں نے اس پر بڑی بحث کی ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم داخل سورۂ فاتحہ ہے یا نہیں۔ امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کے نزدیک تسمیہ داخل سورہ الفاتحہ ہے۔ لیکن امام مالک اسے داخل سورۃ تسلیم نہیں کرتے۔ مالک کی یہ رائے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بسم اللہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی گئی ہے۔ امام اعظم اور صاحب الکشاف بھی بسم اللہ کو داخل سورہ فاتحہ نہیں مانتے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن پاک میں شامل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ ٥ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ہر سورۃ سے قبل بسم اللہ پڑھنے سے دو سورتوں میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

قاضی شہاب الدین نے کئی صفحات اس بحث کی نذر کر دیے ہیں۔

قاضی شہاب الدین شرقی حکومت کے قاضی القضاۃ تھے۔ اس لیے ان پر قانون اسلامی اور فقہ حنفی کا غلبہ تھا۔ موصوف آیات سے مسائل فقہ استنباط کرتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے آغاز میں قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ فاتحہ کی شکل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں دعا کی تعلیم دی ہے۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر لکھتے ہوئے انہوں نے قرآن حکیم کی ان تمام آیتوں کے حوالے دیے ہیں۔ جہاں جہاں ربوبیت کا ذکر آیا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا ترجمہ موصوف نے مالک روز جزا و سزا کیا ہے۔

قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بعض قراء میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی قرأت پر اختلاف ہے چند قراء مالک کی بجائے مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی پڑھتے ہیں۔ قاضی صاحب نے ملک کے معنی بھی درست تسلیم کیے ہیں تاہم وہ لکھتے ہیں کہ مالک پڑھنے سے ایک لفظ بڑھ جاتا ہے۔ اور تلاوت قرآن پر ہر لفظ کی دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اس لیے ملک کی جگہ مالک پڑھنے سے دس نیکیاں اور مل جاتی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام اور شریعت محمدی ہے اور اہل سنت اسی پر چلتے ہیں۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ سے مراد نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کا راستہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ آیت بھی نقل کردی ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ دراصل اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کا بدل ہے۔ دعا میں مقصود اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی راہ ہے، مغضوب علیہم کا راستہ غیر مقصود ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہود اور الضالین سے نصاریٰ مراد ہیں۔ یہود اس لیے بھی مستحق عذاب ہوئے۔ کہ ان بدبختوں نے یہ کہا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ

ان ہی بدنصیبوں کا یہ قول ہے۔

یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ

ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہود اللہ تعالیٰ سے بغض رکھتے تھے، اسی لیے غضب الٰہی کے مستحق قرار پائے۔ نصاریٰ مسلمانوں سے عداوت رکھنے کی بناء پر الضالین ہوئے۔ وہ راہ راست سے بھٹک کر توحید چھوڑ بیٹھے اور تثلیث کے قائل ہو گئے۔

آمین، داخل سورت نہیں ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ آمین دراصل دعا کی قبولیت کی درخواست ہے۔ یہ سریانی اور عبرانی کا لفظ ہے۔ آمین اسی طرح داخل سورہ الفاتحہ نہیں جس طرح اعوذباللہ من الشیطٰن الرجیم داخل فاتحہ نہیں، حالانکہ ہمیں تلاوت سے قبل تعوذ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ باعظمت اور عظیم الشان سورۃ ہے۔ یہی سبعا من المثانی ہے یہی سورۃ شفا ہے۔ یہ معانی و مفہوم کے اعتبار سے پورے قرآن کے برابر ہے، یہ سورت خدا تعالیٰ کے جلال و جمال کی مظہر ہے۔ اس کا مطلع احسن المطالع اور اس کا مقطع احسن المقاطع ہے۔ اس کا مطلع الحمد سے شروع ہوتا ہے اور حمد کا استحقاق صرف اللہ کو ہے، کیونکہ وہی پروردگار عالم ہے۔ مقطع میں اصحاب انعام آئے ہیں جیسے اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ، غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ اس میں ان اللہ والوں کا ذکر ہے جو انعام یافتہ ہیں

سورۂ بقرہ قرآن حکیم کی سب سے طویل سورۃ ہے۔

سورۂ بقرہ سے ۵۰۰ احکام مستنبط ہوتے ہیں صرف آیات مداینت میں ۱۰ حکم ملتے

ہیں۔ اس سورت کے علاوہ اور کہیں قرآن حکیم میں بقرہ کا ذکر نہیں آیا۔ اس لیے یہ تخصیص ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام سورۃ البقرہ پڑا ہے۔

بعض لوگوں نے اپنی غلطیاں چھپانے کے لیے یہ مشہور کر دیا ہے "خطائے بزرگاں گرفتن خطاء است"۔ میں اس خطا کا ارتکاب کرتے ہوئے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں قاضی صاحب کو سہو ہوا ہے۔ سورۃ البقرہ کے علاوہ بھی سورۂ یوسف میں سبع بقرات کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے بقرہ کا ذکر صرف سورۃ البقرہ سے مختص نہیں ہے جیسا کہ قاضی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

سورۂ بقرہ کا سورۂ فاتحہ سے ایک ربط ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ہم نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہہ کر طلب ہدیٰ کی تھی۔ سورۂ بقرہ میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہہ کر صالحین کا راستہ سجھا دیا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے آخر میں مومنوں اور کافروں کا ذکر آیا تھا۔ سورۂ بقرہ میں ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کے مصداق اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ الخ۔ سورۃ البقرہ کا آغاز کتاب کی مدح سے ہوا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اس سورت میں يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ کا خطاب عمومی ہے۔ جہاں يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا آتا ہے۔ وہاں یہ خطاب خصوصی ہو جاتا ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً، میں بعض مفسرین کے نزدیک زمین پر رہنے والے فرشتے ہیں اور خطاب صرف ان سے ہی تھا۔ آدم چونکہ زمین پر اللہ کا خلیفہ تھا اس لیے خطاب بھی ملائکہ ارضی کو ہوا ہے، ملائکہ آسمانی کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو زمین پر آدم کو نائب بنانا مقصود تھا۔ اس لیے ملائکہ ارضی پر ان کو فضیلت دینا تھی۔ ملائکہ ارضی اپنی عبادت، طہارت اور لطافت کی بنا پر خود کو خلیفۃ اللہ سمجھے بیٹھے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی خلافت کو بچانے کے لیے مستقبل میں متوقع خطرے کا اظہار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اَنْبَاَ کا مطلب آدم جانتا تھا۔ ملائکہ ارضی نہ جانتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنی دانست میں غائب کا علم رکھتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ آدم کی فطرت بیان کر چکے تھے۔ جب ان سے اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ کہا گیا تو معلوم ہوا کہ غائب تو کیا وہ تو حاضر کا علم بھی نہیں رکھتے۔

قاضی صاحب نے اس موضوع پر دل کھول کر بحث کی ہے جس سے ان کی شانِ علمی کا اظہار ہوتا ہے

قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا کہہ کر اپنے علم کے محدود ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ قاضی صاحب نے سبحانک پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے اور اسی ضمن میں ان فرشتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ملائکہ ارضی نے تخلیق آدم پر یہ اعتراض کیا تھا۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ تو ملائکہ عرشی يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر اس کی تلافی کر رہے ہیں۔

ابلیس جن تھا یا فرشتہ۔ اس پر بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اسے فرشتہ مانا ہے لیکن راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ وہ جن تھا کیونکہ قرآن حکیم میں ایک جگہ وَكَانَ مِنَ الْجِنِّ آیا ہے۔ اس کے جن ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ خود اس نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

وَخَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ۔

اس کے بعد قاضی صاحب بحث کا رخ موڑتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اگر وہ جن تھا، تو وہ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ کے خطاب میں آتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے جو لوگ اسے فرشتہ مانتے ہیں وہ اسے اس خطاب میں شامل کرتے ہیں لیکن حق بات یہ ہے کہ وہ جن تھا لیکن اکابر فرشتوں کے زمرے میں شامل ہو گیا تھا۔ فرشتوں نے آدم کو جو سجدہ کیا تھا، وہ سجدۂ تحیہ تھا۔ یہ سجدہ امم سابقہ میں رائج تھا۔ جیسا کہ سورۂ یوسف میں مذکور ہے، لیکن شریعت محمدیہ میں یہ سجدہ منسوخ ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ فرشتوں نے آدم کو منبر پر بٹھایا اور منبر کو اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ سب سے پہلے جبرئیل اور میکائیل نے۔ ان کے بعد اسرافیل اور عزرائیل نے آدم کو سجدہ کیا۔ اس کے بعد تمام فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔

میری ناقص رائے میں یہاں قاضی صاحب یہ بھول گئے ہیں کہ یہ چاروں فرشتے آسمانی ہیں۔ ارضی نہیں۔ پہلے وہ ملائکہ آسمانی کو سجدہ سے مستثنیٰ کر چکے ہیں ان کے خیال میں یہ حکم صرف ملائکہ ارضی کو دیا گیا تھا۔ یہاں اس موقع پر انہوں نے ملائکہ آسمانی کو بھی سجدے میں شامل کر دیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی شہاب الدین تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ اس ماہ میں قرآن حکیم لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر آیا اور پھر

آہستہ آہستہ ۲۳ برسوں میں آنحضرتؐ پر نازل ہوا۔ اس ماہِ مقدس میں پہلے پہل دس آیتیں نازل ہوئیں اور اس کا افتتاح شب قدر میں ہوا

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ماہ رمضان میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر آیا اور شب قدر میں آنحضرتؐ پر نازل ہوا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ درحقیقت حضرت عمرؓ کی پریشانی دور کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی موصوف ماہِ رمضان میں رفث الی النساء کے قائل نہ تھے۔ اور ان سے کوئی چوک ہوگئی تھی جس پر وہ پریشان اور پشیمان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کرکے ان کی پشیمانی دور کردی۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کا تعلق اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ کے ساتھ ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ۔ کی تفسیر قاضی صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے الفاظ میں کی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کی تفسیر قاضی صاحب کے الفاظ میں کی ہے میں تو یوں کہوں گا۔

متفق گردید رائے بولعلی بارائے من

قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ انفاق کا حکم کسب حلال میں سے دیا گیا ہے کسب حرام میں سے نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ

اس لیے کسب حرام میں سے صدقہ وخیرات اللہ کے ہاں قبول نہیں ہے۔ ایسی کمائی اور خیرات کے لیے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ

یعنی اسے خبیث مال کی ضرورت نہیں ہے۔

میری ناقص رائے میں جو سمگلر، بلیک مارکیٹئے سیٹھ اور کالا دھن کمانے والے تاجر کسی دینی مدرسے کے مہتمم صاحب کے ہاتھ میں رقم تھما کر دعا کی درخواست کرتے ہیں، ان کی خیرات اور مہتمم

صاحب کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ طیبات سے مراد وہ مال ہے جو مستطاب طبع ہو۔ اسے دیکھ کر خوشی ہو۔ وہ دل کو عزیز اور طبیعت کو مرغوب ہو۔ وہ مال حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی ذیل میں آتا ہو۔ خبیث مال وہ ہے جسے دیکھ کر طبیعت مسرور نہ ہو، وہ مکروہ اور مبغوض ہو۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ شیطان تمہیں انفاق سے روکے گا، وہ تمہیں ڈرائے گا کہ مال خرچ کرنے سے تم غریب ہو جاؤ گے۔ وہ تمہیں مال جمع کرنے کے لیے فواحش کی ترغیب دے گا۔ اس ذیل میں کسب حرام کے تمام وسائل آجاتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہاری مغفرت ہو اور اس کا فضل تمہارے شامل حال رہے۔ یہ اس کی راہ میں، اس کی خوشنودی اور رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے ہی ممکن ہے۔ صرف سورہ البقرہ کی تفسیر ۲۸۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

سورہ آل عمران کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کا ربط سورہ بقرہ سے ہے۔ ان دونوں سورتوں میں مومنوں اور کافروں کا انجام، دونوں سے اللہ کا وعدہ اور ذکر غزوہ و جہاد با دشمنان اسلام مذکور ہیں۔ سورۂ بقرہ میں حضرت آدم کی بغیر ماں باپ کے تخلیق کا ذکر آیا ہے۔ تو سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی بغیر باپ کے پیدائش کا ذکر مرقوم ہے۔ ان دونوں سورتوں میں آیاتِ مباہلہ، اقوال نصاریٰ کا رد اور اہل کتاب کو خطاب موجود ہیں۔ اسی طرح ان دونوں سورتوں میں اہل ایمان کو صبر کی تلقین کی گئی ہے اور تقویٰ پر زور دیا گیا ہے۔

(بقیہ قرآن عظیم کی زبان)

(۱) خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ

(۲) وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ (الاسراء ۷۲)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین۔

قسط نمبر ۲

قرآنِ عظیم کی زبان

محمد خورشید (ہوسٹن، امریکہ)

سورہ زمر میں یہی نکتہ پھر بڑے ہی سادہ اور دلنشیں انداز میں یوں بیان کر دیا۔
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (الزمر ۲۸)
قرآن، عربی زبان والا، جس سے کوئی ٹیڑھا مطلب نکالا ہی نہیں جا سکتا، اس مقصد کے لئے کہ شاید وہ تقویٰ اختیار کرنا چاہیں (تقویٰ: زندگی کا وہ طریقہ جو اللہ کے قوانین کے مطابق اور انکی حفاظت میں گذرے -)

آج اگر ہم دُنیائے اسلام پر ایک غائر نظر بھی ڈالتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی تین چوتھائی آبادی قرآن کو عجمی زبانوں میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے - آپ کے زیر نظر مضمون بھی اُردو زبان میں آپکے سامنے ہے، جو ایک عجمی زبان ہے - یہ نہ ہوگی تو فارسی، ترکی، روسی، انگریزی، یوگوسلاوی، چینی، ملائیشی، انڈونیشی، ہسپانوی، یا کوئی اور زبان ہوگی - اگر ہم صرف اپنی اپنی وطنی زبانوں ہی کے ذریعہ دین کو سمجھنے پر اکتفا کر لیں گے. تو فکری اتحاد کہاں سے اور کیسے پیدا ہوگا - وطن کا عفریت ہمیں کہاں لا کر بے دست و پا چھوڑ گیا ہے؟ اُس کا اندازہ اُس خلفشار سے ہو سکتا ہے جو دُنیائے اسلام میں آج موجود ہے اور آئندہ بھی موجود رہے گا، جب تک وطنیت زندہ ہے۔

ایک اور زاویہ سے دُنیائے اسلام پر نظر ڈالیں گے تو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کی اکثریت دو زبانی (Bilingual) ہے یعنی اردو اور انگریزی، پشتو اور فارسی، ہندی اور انگریزی، بنگلا اور انگریزی، فارسی

اور انگریزی ، روسی اور انگریزی ، چینی اور ویت نامی ، چینی اور جاپانی ، انڈونیشی اور ولندیزی ، ملائیشی اور انگریزی ، عربی اور فرانسیسی ، ولندیزی اور پرتگالی وغیرہ ۔ لیکن مسلمانوں کی اس سے بڑی بھی کوئی کم نصیبی ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر دو زبانیں (Bilingual) بولنے والی اُمت ہونے کے باوجود مسلمانوں نے صرف عجمی زبانوں کو دوسری زبانوں کے طور پر سیکھا ہے اور عربی کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے ۔ اگر ہم مسلمان بننا چاہتے ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا ، کہ ہم سب ہر تن عربی کو دوسری یا تیسری زبان کے طور پر سیکھیں ، ابھی سے سیکھیں ، اور اپنے بچوں کو سکھانا شروع کریں تو مستقبل قریب میں ہم اس کے رُوح افزا نتائج دیکھنا شروع کر لیں گے ۔ لیکن اگر آئندہ بھی صرف عجمی زبانوں میں دو زبانا (Bilingual) ہونا ہمارا مطمح نظر رہا تو افتراق اور انتشار کی یہ خلیج نہ صرف بڑھتی جائے گی ، بلکہ ہمیں بھی لے ڈوبے گی ۔

اگر آپ میں سے کوئی قانون دان ہے یا قانونی زبان سے تھوڑی بہت شناسائی رکھتا ہے تو وہ وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ انسانی قوانین کی زبان اتنی ثقیل ، اور ان کی عبارت اتنی دقیق ، اور انکے جملے اتنے بے ہنگم اور خشک ہوتے ہیں کہ اس زبان کو صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو قانون کی ڈگری لینا چاہیں ، یا جنہیں قانون سے کچھ شد بد کی ضرورت ہو ، کوئی دوسرا پڑھتا ہے تو اُسے نیند آنے لگتی ہے ۔ اس کے عین برخلاف قرآن مبین کو پڑھئے ۔ چند سادہ ، انتہائی دلنشیں اور ایسے بے ساختہ انداز میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے اور میرے لئے قانون مدوّن کیا ہے کہ اُسے جب پڑھیئے ، ایک نئی بالیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ ایک نیا زاویہ سامنے آتا ہے ، ایک نئی اُمنگ پیدا ہوتی ہے ، شرط یہ ہے کہ آپ عربی زبان سمجھتے ہوں ، اور نہ بھی سمجھتے ہوں تو یہ صرف قرآن کریم ہی کا اعجاز ہے کہ آپ پھر بھی اُسے بار بار پڑھتے رہتے ہیں اور طبیعت اچاٹ نہیں ہوتی کیونکہ خالق کائنات چاہتا ہے کہ شاید اس بار بار کی دہرائی میں کبھی تو آپ اُسے تدبّر اور تفکّر سے پڑھنے

کی سعی کریں گے - کیا یہ بجائے خود ایک اور ثبوت نہیں ہے کہ عربی اللہ کی بنائی ہوئی زبان ہے اور ایک خاص مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی ہے -

ایک اور پہلو پر غور کیجئے - اگر آپ شیکسپیئر (Shakespeare) کے مداح ہیں تو آپ نے یقیناً شیکسپیئر (Shakespeare) کو انگریزی زبان میں پڑھا ہوگا - شیکسپیئر کے وہی ڈرامے اور سانیٹ (Sonnet) اردو، جرمن، ہسپانوی یا کسی بھی اور زبان میں پڑھ کر بھی سر دُھنئے تو آپ داد کے قابل ہیں - لوگ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) کو انگریزی میں، ہیگل (Hegel) کو جرمن میں اور رُوسو (Rousseau) کو فرانسیسی زبان میں پڑھ کر ہی لطف اندوز ہوتے ہیں - دُنیا کی ہر زبان کی چوٹی کا ادب اُسی زبان میں خیال آفریں اور سرور انگیز ہوتا ہے - اقبال یا غالب کے کلام کو انگریزی ترجموں سے پڑھ کر دیکھ لیجئے آپ کی حسِ لطافت ان ترجموں کا ماتم کرے گی جنہوں نے اتنے عظیم ادباء اور مفکروں کے کلام سے اس کا پورا زور اور بے ساختگی چھین لی - پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ مطالعہ تو قرآن کا کر رہے ہوں لیکن عجمی زبان میں، اور دعویٰ یہ رکھیں کہ آپ نے قرآن کو سمجھ بھی لیا ہے - قرآن کا اچھے سے اچھا مترجم بھی قرآن کا زور، اُس کی سادگی، اُس کا انداز، اُس کے تیور، اُس کی تشبیہ اور استعاروں کی روانی، ..... اُس کا انذار اور تبشیر آپ کے سامنے ہرگز پیش نہیں کر سکتا جب تک آپ اُسے عربی سے براہ راست نہ سمجھ رہے ہوں - پھر یہ کیسے ہو گیا کہ میں قرآن کو ساری زندگی اپنے لئے ہدایت اور قانون کا منبع مانوں لیکن اُس کی زبان سیکھنے کے لئے مجھ سے ایک قدم نہ اٹھے، جبکہ اس کے برعکس اگر مجھے جرمنی سے کسی مضمون میں ایم اے پی ایچ ڈی، انجینئرنگ یا طب کی ڈگری لینی ہے تو میں جرمن زبان میں مہارت پہلے حاصل کروں گا، فرانس میں اگر مجھے یہی معاملہ پیش آئے گا تو فرانسیسی میں، امریکہ میں تعلیم حاصل کرنی ہے - تو انگریزی میں آپین

کا معاملہ ہوگا تو ہسپانوی زبان میں، لیکن اگر قرآن کی بات ہوگی تو فوراً امیرا ادّعا بدل جاتا ہے، میں یکلخت فیصلہ کرلیتا ہوں کہ قرآن پر تدبّر کے لئے میری اپنی زبان مجھے کافی ہے، قرآن کی زبان سیکھنے کے لئے مجھے چنداں ضرورت نہیں - یہی نہیں بلکہ میں ایک قدم اور آگے جاکر یہ تک کہہ دیتا ہوں کہ میری اپنی زبان میں قرآن عظیم سمجھنے کے لئے اتنا زیادہ مواد موجود ہے کہ خود عربی زبان میں موجود نہیں - کیا مسلمانوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے -

شائد آپ فوراً مدافعت پر اتر آئیں، ارے صاحب، مشرق اوسط میں تو سبھی عربی بولتے ہیں، پھر وہاں سرپھٹول کیوں ہے؟ وہاں افتراق کیوں ہے؟ وہاں انتشار کیسا؟ بات آپ نے بڑے پتے کی کہی ہے - لیکن اگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی فکر کریں گے تو بات فوراً سمجھ میں آجائے گی - اگر صرف عربی بولنے سے انسان اور خاص طور پر مسلمان قرآن کو سمجھ پاتا تو جناب سیّد ابوالحسن علی ندوی کو عالم عربی کا المیہ، ہرگز نہ لکھنا پڑتا - بات کچھ اور ہے - زبان کا آنا ضروری ہے، لیکن جب آپ کو وہ زبان آجائے، یا اگر پہلے ہی سے وہ زبان آپ کی مادری زبان ہے، تو پھر اس زبان کی روشنی میں آپ کے لئے قرآن حکیم پر تدبّر کرنا لازمی ہے، ناگزیر ہے - آپ عربی ہوں یا عجمی، اگر قرآن پر تدبّر اور تفکّر نہیں ہے تو ہمارے حصہ میں صرف ضلال آئے گا، گمراہی آئے گی:

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ - (یونس ۳۲)

(حق سے کنارہ کش ہوجاؤ گے تو صرف ضلال باقی رہ جائیگا)

اسی لئے قرآن نے ہر قدم پر آپ سے مطالبہ یہ کیا ہے:

۱ - أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا
(کیا وہ سب قرآن پر کبھی تدبّر نہ کریں گے، کیا اُن کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں) (محمّد ۲۴)

۲ - وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا - (الفرقان ۷۳)

وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب اُن کے رب کی آیات اُن کے سامنے

پیش کی جاتی ہیں اور آئندہ پیش کی جائیں گی تو وہ (بغیر تدبّر کے) اُن آیات کو بہروں اور اندھوں کی طرح وصول نہیں کرتے (بہرے، جیسے سنا ہی نہیں، اندھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔)

اور صرف تدبّر اور تفکّر پہ بات ختم نہیں ہوتی، قرآن سمجھنے میں آسان لیکن عمل کرنے میں بہت صبر طلب ہے اور قرآن پر جب تک آپکا سابرانہ عمل نہیں ہوگا تو قرآن کی کہی ہوئی سادہ سی بات بھی آپ کے اور میرے پلّے نہیں پڑے گی، اسی لئے قرآن نے بڑی گرجدار آواز میں کہہ دیا۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۔(الصف ۲)

آپ نے دیکھا، قرآن نے پانچ لفظوں میں کیا بات کہہ دی ہے؟

میں اور آپ اسے پھیلانے بیٹھیں تو عمریں گذر جائیں ۔

اختتام پر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے سامنے آپ کی اور اپنی کامیابی کا راز چند سطروں میں بیان کردوں ہر شخص کی یہ فطری تمنا ہوتی ہے۔ کہ وہ جس میدانِ کار میں بھی قدم رکھے، کامیاب نکلے ۔ ہر گروہ اور جماعت کی، چھوٹی ہو یا بڑی، یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں سرفراز ہو۔ شکست کو کوئی پسند نہیں کرتا ۔ ذلّت سے ہر آدمی دور بھاگنا چاہتا ہے ۔ یہ سب باتیں ہمیں صرف اِس صورت، بلکہ شرط پر مل سکتی ہیں کہ ہمارا قرآن پر تدبّر ہو، اور جس حصہ پر ہم تدبّر کرلیں وہ ہمارے عمل میں آشکارا ہو جائے۔ قرآن کا تو واحد مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ہماری عملی زندگی میں ہویدا ہو جائے ۔

کیا مجھے اور آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے صحابہ کرام کا وہ استفسار یاد نہیں جس میں سعد بن ہشام نے پوچھا تھا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا خلق کیسا تھا اور جواب ملا تھا ۔ فَاِنَّ خلق نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان القرآن ۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ ہم اُس لمبی حدیث میں سے اس پورے جملہ کو سامنے رکھیں تاکہ مطلب اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آجائے ۔ پورا جملہ یوں ہے ۔

یا ام المؤمنین انبئینی عن خُلق رسولؐ اللّٰہ. قالت
الست تقرأ القرآن، قُلتُ بلٰی، قالت فان
خلق نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان القرآن

یاام المومنین رضؓ مجھے خلق رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتائیے۔ انہوں نے کہا، کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ؟ میں نے جواب دیا، بیشک (میں قرآن پڑھتا ہوں) ام المومنین نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

معلوم یہ ہوا کہ مسلمان کا اخلاق وہ خُلق ہے جو قرآن پر عمل کرنے سے بنتا ہے، صرف قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے سے نہیں۔

یہیں پر بس نہیں آئیے یہ بھی دیکھ لیں کہ قرن اول کے مسلمانوں کا قرآن کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اور آج ہمارا قرآن کی طرف کیا رویہ ہے۔ الطبری نے جامع البیان میں لکھا ہے :

"عام دستور یہ تھا کہ ہر مسلمان چند آیات (تقریباً دس) یاد کر لیتا تھا، اور اُن سے آگے نہیں پڑھتا تھا، جب تک کہ وہ اُن کا مفہوم نہ سمجھ لے اور اُن کی تعلیم پر اپنی زندگی میں کاربند نہ ہو جائے"

اس پیمانے پر مجھے اور آپ کو اپنی زندگی پر کھتے پر اگر ہزارواں حصّہ بھی اس معیار کے مطابق نظر آجائے تو ہماری ترقی کی اُمید کی جاسکتی ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو قرآن کے معیار کے مطابق ہم مر چکے ہیں۔

اور اب آخری بات سن لیجئے۔ مسلمان، چاہے وہ دُنیا کے کسی خطّہ میں رہ رہے ہوں، جب تک قرآن پر تدبّر اور تفکّر خود قرآن کی زبان میں، اپنی عادت، جبلّت بلکہ فطرت نہیں بنالیں گے اُن کے اندر سے من حیث القوم نہ مفکّر پیدا ہوں گے، نہ مدبّر، نہ سائنس داں جنم لیں گے، نہ عالم، کیونکہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ قوم جو اللہ کے آخری قانون کو قابل التفات نہیں سمجھتی اور اُس پر تدبر نہیں کرتی، اس قابل ہے ہی نہیں کہ اُسے دُنیا میں علم اور امن کی نعمتیں عطا کی جائیں۔ اُن کے لئے تو قانون الٰہی یہ ہے کہ

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

کتابیات

سیرۃ الخلیل (باب ثانی)

حسب و نسب

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

قرآن کریم خدا تعالیٰ کی آخری کتاب اور انسانیت کے لئے آخری ہدایت نامہ ہے۔ اس کا اصل موضوع تو احکام شریعت کی تعلیم اور معاد کی ان ضروری تفصیلات کا بیان ہے جو نیک عملی پر ابھارنے اور بد عملی سے روکنے کے لئے ترغیب و ترہیب کا درجہ رکھتی ہوں تاہم کبھی کبھار اس کے ضمن میں کسی تکوینی حقیقت یا تاریخی واقعے کی طرف بھی ایک آدھ اشارہ کر ہی دیتا ہے گو اس میں بھی بنیادی طور پہ تذکیر بآلاء اللہ اور تذکیر بایام اللہ ہی پیش نظر ہوتی ہے۔

سورۃ صٰفٰت میں حضرت نوح علیہ السلام کے سلسلۂ ذکر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان ہی کا پیرو اور ہم مسلک بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ — اور ان کے طریقہ والوں میں ابراہیمؑ بھی تھے۔

(سورۃ صٰفٰت آیت ۸۳)

گویا کہ آپؑ حسبی طور پر انہی کے اخلاق عالیہ ...... اولوالعزمی اور پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں حوصلہ مندی ...... سے متخلق اور مورد انوار و برکات الٰہی تھے — یہیں پر آپ کو قلب سلیم (زندہ دل) والے کی امتیازی خصوصیت کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

عبرت و موعظت کے سلسلے میں قرآن حکیم نے سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ آپ ہی کے نام اور احوال و واقعات کا تکرار و اعادہ فرمایا ہے اور جابجا امام الناس، ابوالانبیاء، ملت حنیف کے مؤسس، بانی کعبہ، صادق، صالح، شاکر، مصطفیٰ، مجتبیٰ، بردبار و متحمل، نرم دل، رجوع کرنے والے، امت قانت

اور لوگوں کے لئے اسوہ حسنہ (عمدہ نمونے) کی حیثیت سے پیش کیا ہے، سید ولد آدم، امام الانبیاء ختم الرسل محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خدا کی راہ میں غالباً سب سے زیادہ مشقتیں برداشت کرنے اور صعوبتیں جھیلنے والے بارگاہِ الٰہی کے وفادار سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں جو دین و دنیا کی نعمتوں اور سعادتمندیوں کے جامع اور سنگم ہیں اور خدائے قدوس کے وجود کو تسلیم کرنے والی ساری قومیں آپؑ کو ایک عظیم دینی پیشوا اور مقتدیٰ مانتی چلی آئی ہیں۔

آپؑ کے نسب کے بارے میں توریت و تاریخ کی بیسیوں شہادتیں تو موجود ہیں ہی کہ آپؑ حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں، قرآن پاک سے بھی اس مسئلے میں کافی مدد لی جاسکتی ہے مثلاً سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۰۰

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۝

میں بنی اسرائیل کو نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی میں سوار ہونیوالوں کی اولاد بتلایا گیا ہے اور مؤرخین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ رفقاء سفینہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے ابنائے ثلاثہ کے علاوہ کسی کی بھی نسل چلی نہیں ہے اور جب کہ ابراہیم علیہ السلام بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ ہیں تو اس سے واضح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نوح علیہ السلام کے سلسلۂ نسل میں سے ہیں تاہم استدلال کی اس ہیئت سے قطعیت پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا ایک مقدمہ کبریٰ مؤرخین کی کثرتِ رائے پر مبنی ہے جو جانب مخالف کے احتمال صدق کو بالکل زائل نہیں کرتا۔

ہمارے خیال میں اس سلسلے کی سب سے زیادہ قوی قرآنی دلیل سورۃ صٰفّٰت کی آیت نمبر ۷۷ ہے جہاں سیدنا حضرت نوح علیہ السلام پر انعام واکرام خداوندی کے سلسلۂ بیان میں

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ۝ اور ہم نے باقی انہیں کی نسل کو رہنے دیا

کے الفاظ وارد ہیں۔ جس میں باقی کا کوئی بھی حقیقی یا مجازی یعنی حسّی یا معنوی مفہوم خلیل اللہ علیہ السلام کو حضرت نوح علیہ السلام کی طرف منسوب کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

طوفانِ نوح کے بارے میں علماء کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عام تھا اور تمام روئے زمین پر محیط، جس کی وجہ سے سوائے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ کشتی میں

سوار ہونے والوں کے باقی ساری نوع انسانی تباہ ہوئی دوسری یہ کہ طوفان خاص تھا جس سے نوح علیہ السلام کی سرکش اور متمرد قوم تو بلاشبہ ساری کی ساری ہلاک ہوئی مگر اس زمانے کی باقی انسانی آبادیاں اس سے متأثر نہ ہوئیں، توریت پہلی رائے کی مؤید ہے جبکہ قرآن میں صریحاً تو اس مسئلے کا ذکر نہیں اور علامات و قرائن دونوں کی موجود ہیں۔

اگر پہلی رائے صحیح ہو تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ روئے زمین پر انہی..... نوح علیہ السلام..... کی نسل کے سوا سرے سے کوئی رہا ہی نہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام تو کیا کسی بھی فرد بشر کا نسلِ نوحؑ سے ہونا بالکل واضح اور قطعی طور پر غیر مشتبہ ہوگا۔ اور اگر دوسری رائے صحیح ہو تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انہی..... نوح علیہ السلام..... کی ذریت کو بقائے حقیقی..... جو صورت و معنی دونوں کے لحاظ سے ہو، یعنی روئے زمین پر نشأتے الہٰی کی تکمیل کی سعادت اور شہرتِ دوام..... بخشی اور ظاہر ہے کہ ابوالانبیاء ابراہیم علیہ السلام سے بڑھ کر یہ اوصاف کس میں موجود ہیں۔

بہرحال آپ بہرصورت یا تین میں سے ہیں جس کے ناطے سے نوح علیہ السلام کی ذریت اور اولاد قرار پاتے ہیں، یہیں سے حضرت نوح علیہ السلام کے تاریخی لقب "آدم ثانی" کی اصلیت پر بھی تھوڑی بہت روشنی پڑ گئی کہ یا تو بعض مؤرخین کے قول پر یکطرفہ کارروائی ہے اور یا کسی علاقے اور مناسبت سے مجازی اطلاق ہے ورنہ تو طوفان نوحؑ کے خاص اور محدود ہونے کے احتمال کے باوجود اس کی بلا ریب واقعیت کیونکر مانی جا سکتی ہے۔

موجودہ توریت میں آپؑ کا شجرۂ نسب اس تفصیل سے موجود ہے۔

نام مذکور توریت میں	انگریزی نام	کل عمر
ابراہیم علیہ السلام	ABRAHAM	۱۷۵ سال
تارح	TERAH	۲۰۵ سال
ناحور	NAHOR	۱۴۸ سال
سروج	SERUG	۲۳۰ سال
رعو	RAOU	۲۳۹ سال

نام مذکور توریت میں	انگریزی نام	کل عمر
فالج	PELEG	۲۳۹ سال
عابر (ہود علیہ السلام)	EBER	۴۶۴ سال
شالح	SALAH	۴۳۳ سال
ارفکشاد	ARPHAXAD	۴۶۵ سال
سام	SHEM	۶۰۰ سال
نوح علیہ السلام	NOAH	۹۵۰ سال

توریت کی یہ تفصیلات اگرچہ محل نظر ہیں تاہم ہمارے مقصود کی حد تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں..... اس میں کوئی اختلاف و اشتباہ نہیں، وجہ نظر یہ ہے کہ توریت حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان دس پشتوں کا فرق بتلاتی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کو ان کی گیارہویں پشت قرار دے رہا ہے۔ مگر خود توریت ہی کے شارحین کا بعض قوی قرائن کی بنیاد پر خیال یہ ہے کہ نسب نامے کی کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں، ہمارے زمانے کے متداول قریب ترین تاریخی ماخذ بھی اس سلسلے میں متفق الخیال نہیں ہیں۔ ابن جریر اور ابن اثیر شالح اور ارفکشاد کے درمیان ایک اور نام "قینان" کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں، نسب نامے میں "قینان" کا ذکر نہیں کیا ہے بعض لوگوں نے ان کی طرف سے یہ توجیہہ کی ہے کہ قینان جادوگر تھا اس لئے نسب نامے سے ساقط کر دیا گیا۔ یہ توجیہہ جس قدر مضحکہ خیز ہے بھونڈی ہے، بیان کی حاجت نہیں، اصل بات یہ ہے جیسے کہ ہم نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نسب نامہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں باقی رہی اس کی تفصیلی ترتیب تو وہ قطعاً غیر یقینی ہے اس کی ایک دلیل تو یہی اختلافات ہیں جن کو دور کرنے کے لئے یہ بے ڈھنگی تاویلات کی جاتی ہیں اور دوسری دلیل ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے:

"نبی علیہ السلام جب نسب شریف کو بیان فرماتے تو عدنان سے تجاوز نہ فرماتے۔ عدنان تک پہنچ کر رک جاتے اور یہ فرماتے کہ "کذب النسابون" حاملین انساب نے غلط گوئی سے کام لیا۔" (طبقات ابن سعد بحوالہ سیرۃ المصطفیٰ ج۱)

اس سلسلے میں ابن خلدونؒ نے امام شافعیؒ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک موقعہ پر آدم علیہ السلام تک اپنا شجرۂ نسب بیان کیا تھا۔ گویا اس واقعے سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر کذب النسابون والی روایت صحیح ہوتی تو امام شافعیؒ ایسی جرأت کیوں کرتے، ہمارے خیال میں اوّلاً تو امام شافعیؒ کا یہ واقعہ کس حد تک صحیح ہے اور اس کی کیا تفصیلات ہیں یہی محلِ تأمل ہے اور ثانیاً اگر واقعہ بالکل صحیح بھی ہو تو امام شافعیؒ کا استدلال اس کے اجمال سے ہوگا تفصیل سے ہرگز نہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

ابن خلدون، ابن حزم کے حوالے سے نصاریٰ کی بعض کتابوں سے نقل کرتے ہیں کہ فالج اور عابر کے درمیان ایک اور کڑی بھی چھوٹ گئی ہے جس کا نام ملکیصدقؑ ہے اور وہ فالج کا باپ ہے۔

پھر سلسلۂ نسب کی اکثر کڑیوں کی عمروں میں بھی شدید اختلافات ہیں ـــــ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں تارح کی عمر ۲۵۰ سال، فالج کی ۴۳۹ اور فکشاد کی ۴۳۸ بتلاتا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۹۵۰ سال ..... جو توریت میں بیان ہوئی ہے اور جس کی اکثر مؤرخین نے قرآنی آیت فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا ہ کا سہارا لے کر توثیق کرنے کی کوشش کی ہے ..... کی سختی سے تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ تو نوح علیہ السلام کی بعد البعثت اور قبل الطوفان والی عمر ہے۔ پھر ابن عباسؓ کے ایک قول کی تقدیر پر ان کی کل عمر ۱۷۸۰ سال بتلائی ہے، واللہ اعلم۔

(جاری ہے)

درسِ حدیث

تفکّر

ریاض الحق

عن أبی یعلی شداد بن أوس رضی اللّٰہ عنہ عنِ النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نفسَہٗ وعَمِلَ لِمَا بعدَ الموتِ والعاجزُ من أتبعَ نفسَہٗ ھَوَاھَا وتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ الْاَمَانِیَّ (رواہ الترمذی۔)

ابویعلی شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ انھوں نے کہا کہ عاقل (عقلمند) وہ ہے جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اور اس حالت کیلئے عمل کیا جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ اور عاجز (بے بس) وہ ہے جس نے اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کی۔ اور اللہ کے بارے میں جھوٹی اُمیدیں قائم کیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

اِنَّمَآ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا (سورۃ سبأ آیت ۴۶)

میں تو ایک ہی نصیحت کرتا ہوں تم کو کہ اُٹھ کھڑے ہو اللہ کے کام پر دو دو اور ایک ایک پھر دھیان کرو۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ (سورۃ آل عمران آیت ۱۹۰، ۱۹۱)

آسمان اور زمین کا بنانا، رات اور دن کا بدلتے آنا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کیلئے جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور پہلو پہ لیٹے اور دھیان کرتے ہیں زمین اور آسمان کی پیدائش میں۔ کہتے اے رب ہمارے! تو نے یہ بیکار نہیں بنایا تو پاک ہے عیب سے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ (سورۃ غاشیہ آیت ۱۷ تا ۲۱)	بھلا کیا نہیں نگاہ کرتے اونٹوں پر کیسے بنائے ہیں؟ اور آسمان پر کیسا بلند کیا ہے اور پہاڑوں پر کیسے کھڑے کیے ہیں اور زمین پر کیسے صاف بچھائی ہے۔ سو آپ سمجھائیے۔ آپ کا کام یہی ہے سمجھانا۔
اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا۔ (سورۃ القتال آیت ۱۰)	کیا پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھیں۔

دنیا میں انسان کے صحیح طرزِ عمل کا بڑا دارومدار تفکر پر ہے۔ اللہ نے انسان کو عقل، سوچ اور غور و فکر جیسے قوای اور خاصیتوں سے نوازا ہے جو اس کو حیوان سے ممیز کرتے ہیں اور اس کو فطرت کی راہ پر چلنے میں مدد دیتے ہیں۔

مختصر الفاظ میں یہ تفکر ہے اللہ کی عظیم مخلوقات میں فناء الدنیا میں احوال آخرت میں اور اپنے نفس میں۔

مذکورہ بالا حدیث میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں کی گئی ہے وہ یہ کہ انسان عقل مند اس وقت کہلا سکتا ہے جب وہ اپنے نفس پر غور و فکر کرے اس کی کمزوریوں اور اس کی صلاحیتوں کا پتہ چلائے۔ اس کے حملوں اور خطرات سے بچے اور اس کی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنے بھلے کے لیے استعمال کرے چنانچہ مقولہ ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" جس نے اپنے نفس کی حقیقت کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اور جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس نے لازماً اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا۔

اللہ نے انسان کو جو عقل و فکر کی قوتیں عطا کی ہیں۔ انہیں کے بارے میں اس کو سب سے زیادہ تاکید کی ہے کہ وہ تفکر کرے۔

کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ" اسی طرح ہم کھولتے ہیں اپنی آیات ان لوگوں کے لیے جو تفکر کریں" قرآن مجید کا ایک خاص وصف ہے کہ وہ جب اسلام، ایمان اور اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہے تو اس میں صرف ایک حکم دینے کا روکھا انداز نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ دلیل عقل سے لائی جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مذہب ایک ایسا معاملہ ہے جس کو عقل سے بہت تعلق

تعلق ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات سے اس بات کی قطعاً تردید ہوتی ہے۔ قرآن نے انسان کی ہدایت کے لیے سب سے بڑا ذریعہ عقل اور تفکر کو بتایا ہے۔ گویا کہ دین عقل اور فکر کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ جگہ جگہ فکر و نظر کو Appeal کیا گیا ہے عجیب بات ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سب سے پہلی آیت میں اللہ نے گویا آخری فیصلہ غور و فکر پر چھوڑا۔ کہ اے لوگو! میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم اکیلے اکیلے یا دو دو ہو کر غور و فکر کرو اور اپنے دل کا فیصلہ سناؤ کہ کیا یہی بات درست ہے جو تم اپنی زبانوں سے کہہ رہے ہو۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے الٹ پھیر میں عقلمند لوگوں کے لیے آیات ہیں نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں ہیں اللہ کو پہچاننے کی اس کا قرب اور رضا حاصل کرنے کی اس کی بندگی کو اپنے اوپر لازم کرنے کی اور اس میں استقامت حاصل کرنے کی۔ گویا کہ ایمان حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اللہ کی آیات پر تفکر اور غور و فکر پھر اس ایمان میں اضافے کا بھی ایک بہت بڑا ذریعہ ہے تفکر۔ معرفت خداوندی کے نشانات ذرے ذرے میں بکھرے پڑے ہیں لیکن ان کو دیکھ کر خدا کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے تفکر۔ تذکیر بآیات اللہ ایک بہت بڑی یاد دہانی ہے جو غور و فکر سے مکمل ہوتی ہے۔

یہاں ہمارے لیے قابل پہلو یہ ہے کہ ہم اپنے نفس، کائنات، اللہ کی آیات، زندگی کی حقیقت، اور آخرت کے متعلق تفکر کا رویہ اختیار کریں۔ اسی سے انسان اپنا نصب العین متعین کرے گا اور صحیح راہ پر آجائے گا۔ اگر عقل استعمال نہیں کرنا اور فکر نہیں ہے تو کوئی آیت اور کوئی حقیقت نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی بلکہ بے فائدہ ہوگی۔

یہ اونٹ، یہ آسمان، یہ پہاڑ اور یہ زمین سب یاد دہانی کروا رہے ہیں لیکن ان کی یاد دہانی اس وقت تک نہ دے گی جب انسان کے پاس بصیرت ہوگی۔ اضافۂ ایمان اللہ کی پہچان، اس کی شکر گزاری اور تقرب الی اللہ کے لیے سلسلۂ کون و مکان اور مظاہر قدرت میں غور و فکر اور تفکر ضروری ہے۔

قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت

مولانا محمد تقی امینی (قسط نمبر ۹)

"احسن تقویم" میں شعور (نوری کرنوں) اور خواہش (نامیاتی لہروں) کے درمیان مناسبت و قوت کے لحاظ سے روابط قائم ہوتے اور جذب و کشش کی حدیں مقرر ہوتیں پھر کرنوں کے پرتو سے لہروں کی کارکردگی میں تبدیلی کی جاتی ہے بیشمار خصوصیتوں اور صلاحیتوں کی طرح روابط و حدود کے بھی بیشمار درجے اور مرتبے ہیں جو کرنوں اور لہروں کے درمیان مناسبت اور جذب و کشش کی قوت سے وجود میں آتے ہیں ان میں سے کچھ خاص قسم کے رابطے اور حدیں بھی ہیں جو نابغہ اور عبقری صلاحیتوں کے لئے مخصوص ہیں اور جن سے جینیس افراد پیدا ہوتے ہیں ان رابطوں اور حدوں میں کرنوں اور لہروں کا شدید ٹکراؤ ہوتا ہے۔ خواہ دونوں کے درمیان سختی و مضبوطی کی نسبت ہو یا نرمی و لچک کی ہو۔

جینیس (عبقری) کے روابط و حدود دو طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) فجائی ارتقاء۔ اس میں کرنیں ایک دم چھلانگ لگا کر اپنے اظہار پر آمادہ ہوتی ہیں اور پھر لہروں سے شدید ٹکراؤ کی وجہ سے وہ روابط و حدود وجود میں آتے ہیں جو جینیس کے لئے درکار ہیں۔

(۲) تدریجی ارتقاء۔ اس میں بتدریج ارتقاء ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ روابط و حدود ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو جینیس کے لئے درکار ہیں۔

دونوں طریقوں میں جینیس کی صفت پیدائشی و موروثی ہوتی ہے اگر اس کو نشو و نما کا پورا موقع مل گیا تو کسب و ریاضت سے اس کے کارنامے

نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور اگر موقع نہ ملا یا کسب وریاضت اس کے مناسب نہ پایا گیا تو وہ صفت ٹھٹھڑ کر رہ جاتی ہے۔ تدریجی ارتقاء میں وراثت کا اثر سمجھنے میں زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں ہوتی جب کہ فجائی ارتقاء میں وراثتی اثر مخفی رہتا اور کسی میکانیکی عمل کے دائرہ میں نہیں آتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھئے کہ بالعموم ایک پھول کے بیج سے ایک ہی قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی بیج سے ایک علٰحدہ قسم (SPORT) کا پھول پیدا ہوتا ہے نہ ہر بیج سے اس پھول کی توقع کی جاتی اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیج میں کسی خاص اثر کے بغیر ہی یہ پھول پیدا ہو گیا ہے یہ بھی واقعہ ہے کہ وہی بیج کیمیائی اثر یا شعاع کو قبول کرتا ہے جس میں کچھ خصوصیت پہلے سے موجود ہوتی ہے ورنہ ہر بیج کے ساتھ یکساں عمل میں یکساں اثر قبول کرنے میں دشواری نہ ہونی چاہیئے۔

دونوں قسم کے جینس میں شعور (نوری کرنوں) اور خواہش (ناآسباتی لہروں) کے درمیان شدید ٹکراؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے نفسی قوتوں اور ان کے اظہار میں توازن برقرار نہیں رہ پاتا اور ایک جینیس اپنے میدان میں نادر روزگار ہونے کے باوجود زندگی کے دوسرے میدانوں میں کھویا کھویا رہتا اور غیر متوازن اقدام سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے لیکن پہلی قسم میں یہ ٹکراؤ زیادہ نمایاں ہوتا ہے کہ زندگی اس سے ظالمانہ سلوک کرتی اور ماحول اس کے سامنے قدم قدم پر رکاوٹوں کے سنگ گراں حائل کرتا ہے۔ ایک طرف اندرونی مطالبہ کسی ایک حالت پر سکون سے نہیں رہنے دیتا اور ہر پانے کے بعد دوسرے آگے کو حاصل کرنے کے لئے مضطرب وبے قرار رکھتا ہے اور دوسری طرف ماحول کی ناسازگاریاں اس کے احساسات وادراکات کو کچل دینے پر تلی رہتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک موچی کا بچہ، ایک کسان کا لڑکا ایک جاہل وگنوار کا بیٹا مدتوں اپنے معمولی کام میں لگا یاس وحرماں کی تصویر بنا رہتا ہے کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ آگے چل کر وہ کیا بنے گا لیکن ایک موقع آتا ہے کہ وہ

تاریخ میں آفتاب و ماہتاب بن کر نمودار ہوتا ہے۔

اس طویل مرحلہ میں اس کی مضطربانہ کیفیت کس درجہ کی ہوتی ہے حالات و ماحول کی ناسازگاریاں اس کے آبگینہ کو کچل کر کس مقام پر لے آتی ہیں ہم اس کا اندازہ لگانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر ایسی حالت میں اس کے احساسات و میلانات زندگی کے دوسرے شعبوں میں غیر متوازن ہو جائیں یا پانے کے لئے کھونے کی پالیسی پر اس انداز سے عمل پیرا ہوں کہ اپنے ماحول میں اس کی زندگی ناکام قرار دیدی جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ پھولوں کی حفاظت و نگرانی کے لئے کانٹوں کی پہرہ داری و چوکیداری کیوں ضروری ہے؟ ہم عاجز و مسکین بندے تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ پھولوں سے استفادہ کے لئے کانٹوں کے برداشت کا حوصلہ ضروری ہے۔

خصوصیتوں، صلاحیتوں ان میں کمی بیشی اور جینئس کی پیدائش کے سلسلے میں یہ توجیہ اس بنیاد پر ہے کہ شعور کی مستقل اکائی تسلیم کی گئی اور اس کا سرچشمہ نوری کرنوں کو قرار دیا گیا ہے (یہ علیحدہ بات ہے کہ جوہر انسانیت میں نہ شعور ہمہ وقت آزاد رہتا اور نہ اس کے اور خواہش کے درمیان ہمہ وقت تضاد کی نسبت برقرار رہتی ہے) جدید دنیا نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس میں نہ شعور کی مستقل اکائی تسلیم کی گئی اور نہ اس کا سرچشمہ ذہن انسانی ہے جو اربوں خلیات کی مخصوص ترکیب و ترتیب کا نام ہے جن کا دماغ بنتا ہے، یہ خلیات سبھی کے ذہن میں ہوتے ہیں اور انہیں کی ترکیب و ترتیب مختلف افراد کی ذہانتوں میں فرق کا سبب بنتی اور خصوصیتوں، صلاحیتوں، تیزان میں کمی بیشی کی جسمانی بنیاد ان خلیات کی باہمی ترکیب و ترتیب قرار پاتی ہے چنانچہ ایک خاص قسم کی ترکیب و ترتیب سے کوئی خصوصیت و صلاحیت اور ان میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہے اور دوسری قسم کی ترکیب و ترتیب سے کوئی اور خصوصیت و صلاحیت اور ان میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح انسانی ذہن، اس سے پیدا ہونے والا شعور مکمل دماغ کے تابع قرار پاتا اور خواہش کی طرح شعور بھی جسم ہی کی طبعی زندگی کے تقاضے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس توجیہ میں جو

خلا پایا جاتا ہے اور اس پر جو اعتراض وارد ہوتے ہیں اور جواب میں ناکامی سے جو مایوسی ابھرتی ہے ان سب کی تفصیل اس وقت زیر بحث نہیں ہے۔ غالباً انہیں کا نتیجہ ہے کہ کافی دنوں سے اس قسم کی آوازیں اٹھنے لگی ہیں شعور مادّی نہیں ہے،، شعور مشینی عمل نہیں ہے،، شعور میکانیکی عمل کا نتیجہ نہیں ہے یہ آوازیں بجائے خود علم و تحقیق کی دُنیا کی بے اطمینانی پر دلالت کرتی اور کسی خوش آئندہ مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ دوسری بہت سی حقیقتوں کی طرح ان آوازوں کو بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہو جائے اور پھر برقی ذرات کی طرح نورانی کرنوں کی نمود آرائیوں پر ریسرچ و تحقیق ہونے لگے۔

تاریخ انسانی میں جینیس کا کردار دو طرح پایا گیا ہے۔

(۱) عام اور (۲) خاص

عام جینیس میں خواہش شعور کے تابع نہیں ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی خواہشات کی زندگی طرح طرح کی ناہمواریوں میں مبتلا رہتی ہے لیکن خاص جینیس میں خواہش شعور کے تابع ہو کر ناہمواریوں کے اظہار سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

خاص جینیس کا درجہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے جس کے ظہور پذیر ہونے کے لئے کرنوں اور لہروں کا شدید ٹکراؤ کافی نہیں بلکہ خارج سے کچھ مزید نوری قوت پہنچانے کی ضرورت ہے اور پھر اس کے ذریعہ کرنوں اور لہروں کے موجودہ تناسب میں تبدیلی ہو کر شعور اور خواہش میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھیئے کہ جس طرح برقی و مقناطیسی لہروں کے ڈالنے سے دماغی سیلوں کی برقی اکٹوِیٹی میں تبدیلی کی جاسکتی ہے جو سیل کے مثبت و منفی چارج کے تناسب میں تبدیلی سے رونما ہوتی ہے۔ اسی طرح مزید نورانی قوت پہنچانے سے رسولؐ اور نبیؑ کے علمی و عملی اکٹوِیٹی میں تبدیلی کی گئی تھی۔ جو مثبت و منفی (نوری کرنیں و نامیاتی لہریں) چارج کے تناسب میں تبدیلی سے رونما ہوئی تھی۔

پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خارج سے مزید نورانی قوت پہنچانے کی بھی

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام (۱۳)

مزارعت اور ائمہ اربعہ

از قلم: مولانا محمد طاسین

آیئے اب یہ دیکھیں کہ مزارعت کے متعلق چار ائمہ مجتہدین کا موقف کیا ہے جن کے علم و فضل، فہم و تفقہ اور ورع و تقویٰ پر امت مسلمہ کی عظیم اکثریت کا اعتماد رہا اور ان کو فقہ میں مجتہد مطلق اور امام تسلیم کیا گیا ہے اور پھر جن کے اجتہادات کی بنیاد پر چار فقہی مذاہب وجود میں آئے جو حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کے ناموں سے مشہور و معروف ہیں۔ اور جن کی طرف نسبت کو کروڑ ہا مسلمان اپنے لئے باعث فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان چار ائمہ سے میری مراد امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل ہیں۔ اور جو اپنی بے پناہ شہرت کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

مزارعت کے جواز و عدم جواز سے متعلق ائمہ اربعہ کا جو موقف ہے اس کے علم کا اصل ذریعہ خود ان کی اپنی کتابیں اور ان کے تلامذہ کی کتابیں ہیں۔ لہٰذا اس بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم ان اصل اور ابتدائی کتابوں کی طرف رجوع کریں اور یہ دیکھیں کہ ان کے اندر مزارعت کے متعلق ائمہ کا موقف کیا لکھا ہے۔ وہ اسے جائز اور صحیح گردانتے تھے یا ناجائز اور باطل۔ چونکہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں اپنی کوئی کتاب نہیں ملتی بلکہ ان کی فقہ سے متعلق وہی کتابیں ہیں جو ان کے دو نہایت قابل اور ارشد تلامذہ امام محمد شیبانی اور قاضی ابو یوسفؒ نے لکھی ہیں جنہیں صاحبین کہا جاتا ہے لہٰذا مسئلہ مزارعت کے متعلق امام ابوحنیفہ کا موقف معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کی کتابوں کو دیکھا جائے جو مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ امام مالک کے موقف کو جاننے کے لئے المؤطا جو ان کی اپنی کتاب ہے اور المدونۃ الکبریٰ جو ان کے معتمد علیہ شاگرد امام سحنون کی جمع و تالیف کردہ ہے کو دیکھنا چاہیئے۔ امام شافعی کے مسلک کو معلوم کرنے کے لئے خود ان کی کتاب الام کو اور امام احمد بن حنبل کا موقف جاننے کے لئے مختصر الخرقی کو دیکھنا ضروری ہے، صدیوں بعد لکھی ہوئی

متاخرین کی کتابوں پر اس سلسلہ میں تمام تر انحصار نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ بعد کے فقہاء عموماً اپنے امام کے موقف سے ہٹ گئے اور بعض نے اپنے امام کے موقف کی غلط ترجمانی بھی کی جس کا بڑا سبب ان کے زمانوں کے مخصوص معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات تھے، بہرحال جب اصل اور بنیادی کتابیں دستیاب ہیں تو انہی پر اعتماد و بھروسہ کرنا چاہئے۔

امام ابوحنیفہؒ اور مزارعت

مزارعت کے متعلق امام ابوحنیفہ کا موقف معلوم کرنے کے لئے جب ہم قاضی ابویوسفؒ کی کتاب "کتاب الخراج" کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں دو جگہ ہمیں ایسی عبارتیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مزارعت کا معاملہ ایک فاسد اور قطعی ناجائز معاملہ تھا۔ پہلی عبارت یہ ہے کہ:

كان ابوحنيفة رحمه الله ممن يكره ذلك كله في الارض البيضاء وفي النخل والشجر بالثلث والربع واقل واكثر

(ص ۸۸ - الخراج)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے تھے جو مزارعت و مساقات کی ہر شکل کو برا اور ناجائز فرماتے تھے۔ وہ خالی زمین میں ہو یا باغ و درختوں میں تہائی کے بدلے ہو یا چوتھائی کے یا اس سے کم کے یا زیادہ کے۔

دوسری عبارت حسب ذیل ہے:

وجه آخر المزارعة بالثلث والربع فقال ابوحنيفة في هذا انه فاسد وعلى المستاجر اجر مثلها۔

(ص ۹۱ - کتاب الخراج)

دوسری شکل ہے مزارعت تہائی اور چوتھائی پر، سو امام ابوحنیفہ کا اس کے متعلق موقف یہ ہے کہ وہ فاسد معاملہ ہے اور مستاجر پر اجر مثل اجیر یعنی کاشتکار کے لئے لازم ہوتا ہے۔

آخری جملے کا مطلب یہ کہ اگر کہیں دو آدمیوں نے آپس میں یہ معاملہ کر لیا ہو تو اسے فسخ کر دیا جائے اور کاشت کار نے جو محنت کی ہو اس کا اسے رواج کے مطابق معاوضہ

ادا کیا جائے یعنی مالک زمین اس کو اس کی محنت کی اجرت ادا کرے اور کاشت کار کا کوئی مالی خرچہ ہوا ہے تو وہ بھی اس کو ادا کرے۔

اسی طرح قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی ایک اور کتاب جس کا نام ہے : اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ، میں لکھا ہے یہ کتاب بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے

واذا اعطى الرجل الرجل ارضا
مزارعة بالنصف او الثلث
او الربع، او اعطى نخلا وشجرا
معاملة بالنصف او اقل من
ذلك او اكثر فان ابا حنيفة
كان يقول هذا كله باطل
لانه استاجره بشئ مجهول
ويقول أرائيت لو لم يخرج من
ذلك شيئ أليس كان عمله
ذلك بغير اجر.
(ص ۴۱، ۲۴ ۔ کتاب مذکور)

اور جب ایک آدمی دوسرے آدمی کو
زمین مزارعت پر دے نصف کے عوض
یا تہائی یا چوتھائی کے عوض، یا ایک شخص
باغ و درخت دوسرے کو مساقاۃ پر دے
بعوض آدھے پھل یا آدھے سے کم یا آدھے
سے زیادہ کے، تو امام ابو حنیفہ فرماتے
تھے یہ سب معاملہ باطل ہے کیونکہ اس
میں ایک شخص دوسرے کو اجیر بناتا ہے۔
مجہول اُجرت کے بدلے، اور یہ بھی فرماتے
کہ بتلائیے اگر کسی وجہ سے کھیت اور
باغ میں کچھ بھی پیدا نہ ہو تو ایسی صورت
میں اس اجیر یعنی کسان و باغبان کا کیا کرایا سب کام بغیر اجرت کے تہس نہس ہو کر رہ جائے گا؟

اس عبارت میں یہ جو الفاظ ہیں " فان ابا حنيفة كان يقول هذا كله باطل" یہ اس پر نہایت واضح طور پر دلالت کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ آخر دم تک مزارعت کو ایک باطل معاملہ فرماتے رہے کیونکہ کان یقول ماضی استمراری کا صیغہ ہے، اسی طرح اس عبارت میں اس معاملہ کے باطل ہونے کی جو وجہ بتلائی گئی ہے وہ بھی اس معاملے کے مستقل اور دائمی بطلان پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی کاشتکار کے لئے اس کے کام کی اجرت کا مجہول اور غیر یقینی ہونا

بعض احادیث نبویہ میں واضح ہدایت ہے کہ اجیر و مزدور سے کام لینے سے پہلے اسکو بالکل واضح طور پر بتلا دیا جائے کہ اس کی کتنی اجرت ہو گی یعنی باعتبار کمیت و مقدار کے اجرت

کا واضح تعین ہو مثلاً سنن الدارقطنی میں ہے:

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا استأجر احدکم اجیرا فلیعلمہ اجرہ۔ (ص ج ۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی دوسرے کو اجیر بنائے تو ضرور اسے اس کی اجرت کی مقدار بتلا دے۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن استیجار الاجیر حتی یبین اجرہ (ص ۶۸ - ج ۳ - مسند احمد)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کسی کو اجیر مقرر کرنے اور کسی سے اجرت پر کام لینے سے یہاں تک کہ اس کیلئے اس کی اجرت بالکل واضح کر دی جائے۔

امام ابوحنیفہ کے دوسرے شاگرد امام محمد الشیبانی مؤطا میں لکھتے ہیں:

وبھذا نأخذ لا بأس بمعاملۃ النخل علی الشطر والربع ومزارعۃ الارض البیضاء علی الشطر والثلث والربع وکان ابوحنیفۃ یکرہ ذلک ویذکر ان ذلک ھو المخابرۃ التی نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ص ۳۵۷ - مؤطا محمد

اور اس کو ہم لیتے اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ باغ کا معاملہ نصف یا چوتھائی پر کیا جائے یا زمین کا معاملہ نصف یا تہائی یا چوتھائی کے مزارعت پر کیا جائے اور ابوحنیفہ اس کو حرام اور ناجائز سمجھتے اور کہتے تھے کہ یہ وہی مخابرہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا اور منع فرمایا ہے

اس عبارت میں امام محمد الشیبانی نے اپنے متعلق یہ بتلایا ہے کہ وہ مزارعت کے جواز کے قائل ہیں لیکن ان کے استاذ امام ابوحنیفہ اس کے عدم جواز کے قائل تھے امام محمدؒ کی دوسری کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ مزارعت کو مکروہ، فاسد و ناجائز معاملہ گردانتے تھے، مثلاً کتاب جامع صغیر میں لکھتے ہیں:

محمد عن یعقوب عن ابی حنیفۃ

محمد نے یعقوب یعنی قاضی ابویوسفؒ سے

قال المزارعة فاسدة ، فان سقی الارض وکربها ولم یخرج شیئا فله اجر مثله۔

(ص ۱۴۸ - جامع الصغیر)

روایت کیا انہوں نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا مزارعت فاسد معاملہ ہے۔ اگر کسی نے زمین سینچ اور جوت لی اور کوئی شے اس سے پیدا نہیں ہوئی تو کاشت کار کے لئے اجر مثل ہوگا۔

اور پھر متقدمین میں سے امام جعفر طحاوی کو لیجئے جو مذہب حنفی کے زبردست حامی اور ترجمان مانے گئے ہیں۔ اپنی حدیث اور فقہ کی کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مزارعت ناجائز اور صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہے۔ مثلاً اپنی کتاب مختصر الطحاوی میں لکھتے ہیں۔

ولا بأس بالمزارعة علی جزء من الاجزاء ما تخرج فی قول ابی یوسف ومحمد بن الحسن ولا یجوز ذلک فی قول ابی حنیفة

ص ۱۳۳ - مختصر الطحاوی

اور کچھ حرج نہیں مزارعت میں پیداوار زمین کے حصوں میں سے کسی حصہ پر ابویوسف اور محمد بن الحسن کے نزدیک اور امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق یہ جائز نہیں۔

علامہ السرخسیؒ المبسوط میں لکھتے ہیں :

ان المزارعة والمعاملة فاسدتان فی قول ابی حنیفة وزفر وفی قول ابی یوسف ومحمد هما جائزتان

(ص ۱۷ - ج ۲۳)

بلاشبہ مزارعت اور مساقات دونوں فاسد معاملے ہیں امام ابوحنیفہ اور زفر کے فرمانے کے مطابق اور ابویوسف اور محمد کے فرمانے کے مطابق دونوں جائز ہیں۔

قدوری جو فقہ حنفی کا نہایت مستند متن ہے، میں ہے :

قال ابوحنیفة المزارعة بالثلث والربع باطلة

(ص ۱۵۸)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا تہائی اور چوتھائی کے بدلے مزارعت ایک باطل معاملہ ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں علامہ الکاسانی لکھتے ہیں :

واما شرعية المزارعة فقد اختلف فيها قال ابوحنيفة انها غير مشروعة وبه اخذ الشافعي وقال ابويوسف ومحمد انها مشروعة

(ص ۱۷۵ - ج ۶)

اور بہرحال مزارعت کی مشروعیت کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اس کے غیر مشروع ہونے کے قائل ہیں۔ اور اسی کو امام شافعی نے بھی لیا ہے۔ اور قاضی ابویوسف اور محمد اس کے مشروع ہونے کے قائل ہیں۔

ہدائے میں بھی علامہ مرغینانی نے یہی لکھا ہے۔

لا تجوز المزارعة والمساقاة عند ابي حنيفة

مزارعت اور مساقات دونوں ناجائز ہیں امام ابوحنیفہ کے نزدیک

غرضیکہ فقہ حنفی کی ان ابتدائی اور بنیادی کتابوں میں جو امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں اور متقدمین نے لکھی ہیں، اس بات کی پوری صراحت ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مزارعت کا معاملہ باطل، فاسد، مکروہ، غیر مشروع اور ناجائز معاملہ تھا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ابتدائی کتابوں میں کراہیت کا لفظ حرمت کے تقریباً ہم معنی تھا۔ ظاہر ہے کہ مجموعی طور پر یہ سارے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ امام اعظم کی نظر میں اس معاملہ کی نہی تنزیہی نہ تھی تحریمی تھی اور وہ شدت و سختی کے ساتھ اس معاملے کے مخالف اور اسے بالکل ختم کر دینے کے حق میں تھے۔ لہٰذا چھٹی صدی کے ایک فقیہہ حاوی القدسی کا یہ لکھنا کہ:

"كرهها ابوحنيفة ولم ينههنها اشد النهي"

"امام ابوحنیفہ نے مزارعت کے متعلق کراہیت کا اظہار تو کیا لیکن سختی کیساتھ اس سے روکا نہیں"

کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے! اگر ایسی بات ہوتی تو خود ان کے دو شاگرد جو اس مسئلہ میں ان سے اختلاف بھی رکھتے تھے یہ توجیہہ پیش کر کے حقیقی اختلاف کی نفی کر سکتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے برابر اس کا اثبات اور اظہار کیا، علاوہ ازیں جس شخص کی نظر ان دلائل پر ہو جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزارعت کے عدم جواز میں پیش کئے ہیں وہ کبھی بھی علامہ حاوی القدسی کی مذکورہ بات سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ وہ دلائل مزارعت کی شدید قباحت اور حرمت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً صاحب الہدایہ نے جو دلائل لکھے ہیں ان میں سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے مخابرہ سے

منع فرمایا ہے اور مخابرہ کے متعلق ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جوا سے نہ چھوڑے اس کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے یا یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے برسرپیکار اور مصروف جنگ ہے، اور چونکہ ربٰو کو نہ چھوڑنے والوں کے لئے بھی قرآن مجید میں بعینہٖ یہی وعید اور دھمکی ہے جسے قرآن نے قطعی طور پر حرام بتلایا ہے لہٰذا اس سے مخابرت کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جو مزارعت ہی کا دوسرا نام ہے دوسری دلیل جو قیاسی نوعیت کی ہے یہ کہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ قفیز الطحان سے منع فرمایا ہے جس کا مطلب یہ کہ اس طرح سے چکی والے سے آٹا نہ پسوایا جائے کہ اس کی اجرت پسے ہوئے آٹے میں سے ایک پیمانہ ہوگی، مطلب یہ کہ جو چیز اجیر و مزدور کی محنت سے وجود میں آئے اس میں سے کچھ اس کی اجرت نہ مقرر کی جائے۔ بلکہ الگ سے اجرت ہونی چاہیئے اور چونکہ مزارعت کے معاملہ میں بھی یہی طے پاتا ہے کہ کاشت کار کو اس کی محنت سے پیدا شدہ غلّے وغیرہ کا ایک حصّہ اس کی محنت کے عوض ملے گا لہٰذا حدیث مذکور کی رو سے یہ ممنوع و ناجائز قرار پاتا ہے۔

تیسری دلیل بھی قیاسی قسم کی ہے جس کی تفصیل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اجارے کے ایسے معاملے سے منع فرمایا ہے جس میں اجیر کے لئے اس کی اجرت کمیت و کیفیت کے لحاظ سے مجہول اور غیر یقینی ہو، اور چونکہ مزارعت میں بھی کاشتکار کی اجرت مجہول اور غیر یقینی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے مطابق معاملۂ مزارعت ممنوع و ناجائز قرار پاتا ہے اور حدیث خیبر کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اہل خیبر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ طے فرمایا تھا وہ مزارعت کا معاملہ نہ تھا بلکہ خراج مقاسمت کا معاملہ تھا۔ جو آج بھی جائز ہے اور مسلمان سربراہِ حکومت، اپنے غیر مسلم ذمّیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر سکتا ہے۔

غرضیکہ مزارعت کے عدم جواز سے متعلق امام ابوحنیفہ کے مذکورہ دلائل ثابت اور واضح کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ معاملہ بنیادی طور پر ایک ممنوع اور ناجائز معاملہ تھا اور وہ اس کی کسی شکل کو جائز و درست نہ سمجھتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ اگر امام اعظم کے نزدیک مزارعت کا معاملہ بنیادی اور جوہری طور پر ایک باطل اور فاسد معاملہ تھا تو اس معاملہ سے متعلق وہ بعض ایسی تفریعات کے کیوں قائل ہوئے

جو ایک بنیادی طور پر باطل معاملہ سے متعلق نہیں ہوسکتیں مثلاً ان کا یہ فرمانا:

فان سقی الارض وکربھا ولم یخرج شیئاً فلہ اجر مثلہ (ص ۱۴۸ ۔ جامع الصغیر)	پس اگر کاشت کار نے دوسرے کی زمین کو پانی سے سینچ دیا اور جوت دیا اور کوئی چیز زمین سے برآمد نہ ہوئی تو ایسی صورت میں کاشت کار کے لئے مالک زمین پر اجر مثل ہوگا۔

تو اس سوال کا جواب وہی ہے جو بعض علماء نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

ان الامام کان یعلم ان الناس لیسوا بعاملین علی مسألتی نفرع المسائل علی انھم ان زارعوھا فما ذا تکون احکامھا (ص ۲۹۵ ۔ ج ۳ ۔ فیض الباری)	چونکہ امام صاحب یہ جانتے تھے کہ لوگ مزارعت کے معاملہ میں میرے قول پر عمل کرنے والے نہیں لہٰذا انہوں نے کچھ مسائل کی اس طرح تفریع کی کہ اگر کچھ لوگ مزارعت کا معاملہ کریں تو اس صورت میں اسکے احکام کیا ہونگے؟

مطلب یہ کہ امام اعظم نے مزارعت سے بعض فروعی مسائل کے بارے میں جو بعض احکام تجویز کیے، وہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کے نزدیک یہ معاملہ بنیادی طور پر باطل معاملہ نہ تھا بلکہ اس وجہ سے تجویز کئے کہ کاشت کار کو اس کے عمل و کام کا معاوضہ ضرور ملے۔ اور اس کی محنت و مشقت یونہی رائیگاں نہ جائے۔ اسی طرح بیج والے کو اس کے بیج کا عوض ضرور ملے جو اس کا حق ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دو نامور شاگرد قاضی ابویوسف اور امام محمد الشیبانی اپنے استاذ کے برخلاف جواز مزارعت کے قائل تھے اور جیسا کہ ان کی اپنی کتابوں میں مذکور ہے وہ اس کے جواز میں ایک معاملۂ خیبر والی حدیث بطور دلیل پیش کرتے تھے اور دوسری یہ قیاسی دلیل کہ مزارعت، مضاربت کے مشابہ ہے لہٰذا جب مضاربت جائز ہے تو مزارعت بھی جائز ہونی چاہیئے، تیسرے صحابہ و تابعین کے بعض آثار پیش کرتے تھے جو پیچھے آثار کی بحث میں ہم نے نقل کیے۔ رہا حدیث خیبر سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے یا نہیں اس پر گذشتہ صفحات میں کافی تفصیل سے بحث ہوچکی اور جس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس حدیث سے مسلمانوں کے درمیان

... معاشرے کا قیام تھا وہ مزارعت کے جواز کی بنیاد پر نہیں بلکہ عدم جواز کی بنیاد پر ہی عمل میں آسکتا تھا ۔ میں سمجھتا ہوں امام ابوحنیفہ کی نظر ان تمام پہلوؤں پر تھی ۔ لہٰذا انہوں نے غلط حالات کے ساتھ مصالحت کی بجائے مزارعت کے متعلق وہ موقف اختیار کیا جو اسلام کے اصل منشا کے مطابق اور نظری طور پر بالکل صحیح و درست تھا ۔ اور کہنا چاہیئے کہ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے مزارعت کے بارے میں امام ابوحنیفہ کے موقف کو چھوڑ کر قاضی ابویوسف کے موقف کو عملاً اختیار کیا اور اس کی وجہ سے ان کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا ۔ بہرحال چونکہ امام ابوحنیفہ کا موقف صحیح اور حق تھا لہٰذا وہ علمی و نظری طور پر قائم اور زندہ رہا ۔ ہر دور کے اندر کتابوں میں بھی لکھا گیا اور درس و تدریس میں اس کا برابر ذکر رہا اور ہر دور میں علماء کی ایک بڑی جماعت اس کی حمایت و تائید بھی کرتی رہی ۔ اور پھر معاشیات کے موجودہ دور میں اسلام کے معاشی نظام کی ، اشتراکی نظام پر بہتری و برتری اگر ہم نظری طور پر ثابت کر سکتے ہیں تو مزارعت کے متعلق قاضی ابویوسف کے موقف کی بنا پر نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ کے موقف کی بنا پر [illegible] جو مزارعت کے عدم جواز کے قائل تھے ۔

امام مالک رح اور مزارعت

امام ابوحنیفہ کی طرح امام مالک مدنی بھی مزارعت کے عدم جواز کے قائل تھے اور اس کو ایک فاسد و باطل معاملہ بتلاتے تھے ۔ اس کا سب سے یقینی ثبوت امام موصوف کی مشہور اور مستند کتاب المؤطا کی اس عبارت سے فراہم ہوتا ہے ۔

فاما الرجل الذی یعطی ارضہ البیضاء بالثلث والربع مما یخرج منها فهذا مکروہ (ص ۲۹۴)	لیکن جو شخص اپنی سفید زمین دوسرے کو کاشت کے لئے دیتا ہے پیداوار زمین کی تہائی اور چوتھائی کے بدلے تو یہ معاملہ مکروہ ہے ۔

مؤطا امام مالک کے شارح علامہ محمد الزرقانی نے عبارت مذکور کے آخری جملے " فهذا مکروہ " کی شرح میں لکھا ہے : " ای حرام " یعنی حرام ہے ۔ ص ۳۷۰ ج ۳ ۔

اسی مؤطا میں کچھ آگے یہ عبارت ہے :

سئل مالک عن رجل اکری	امام مالک سے پوچھا گیا ایک شخص کے متعلق

مزرعته بمائة صاع من تمر او مما يخرج منها من الحنطة او من غيرها يخرج منها فكره ذلك (ص ۲۹۷)

جس نے اپنا کھیت دوسرے کو کاشت کے لئے دیا بعوض ایک سو صاع چھوہاروں کے یا اسی کھیت سے پیدا شدہ گندم کے یا کسی اور پیداوار کے، تو مالکؒ نے اسے مکروہ بتلایا۔

شارح مؤطا علامہ زرقانی نے "فکرہ ذلک" کی شرح کی ہے "کراھتہ منع" یعنی کراہتہ تنزیہہ نہیں کراہتہ تحریم۔

دوسری کتاب "المدونۃ الکبریٰ" جس کے راوی امام مالک سے عبدالرحمٰن بن القاسم اور ان سے امام سحنون بن سعید ہیں۔ اس کی ایک عبارت مزارعت کے متعلق حسب ذیل ہے :-

قلت أرأيت ان اكريت ارضا من رجل يزرعها قضبا او بقلا او قمحا او شعيرا او قطنية فما اخرج الله منها من شيئ فذلك بيني وبينه نصفين أيجوز هذا ام لا فقال مالك ان ذلك لا يجوز۔

(ص۴۷۲ ، ۴۷۳ ۔ ج ۳)

میں نے امام مالک سے عرض کیا آپ یہ بتلائیں کہ میں ایک شخص کو اپنی زمین دیتا ہوں کہ وہ اس میں ترکاریاں، سبزیاں یا گندم یا جو یا کپاس کاشت کرے پس اللہ تعالیٰ جو اس سے پیدا کرے وہ میرے اور اس کے درمیان نصف نصف ہوگا، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا ناجائز؟ تو امام مالک نے جواب میں فرمایا: یہ معاملہ جائز نہیں۔

علامہ ابن رشد مالکی بدایۃ المجتہد میں مزارعت و مخابرت کے متعلق لکھتے ہیں :

اما حجته على منع كراءها بما تنبت فهو ما ورد من نهيه صلى الله عليه وسلم عن المخابرة قالوا هي كراء الارض بما يخرج منها، وهذا قول مالك وكل اصحابه

لیکن امام مالک کی دلیل اس پر کہ پیداوار زمین کے ایک حصہ کے بدلے کرایہ الارض ممنوع ہے وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے، علماء نے کہا ہے کہ مخابرہ نام ہے پیداوار زمین کے ایک

(ص ۲۱۰ - ج ۲) حصہ پر زمین کو کرائے پر یعنی مزارعت
پر دینے کا، یہی قول ہے امام مالک اور ان کے تمام ساتھیوں کا۔

آخری جملے سے صاف ظاہر ہے کہ مخابرت و مزارعت کے ممنوع و ناجائز ہونے پر امام مالکؒ ان کے تلامذہ اور دیگر تمام مالکی علماء و فقہاء کا اتفاق و اتحاد تھا۔ احناف کی طرح ان کے مابین اختلاف نہ تھا۔ فقہ مالکی کی کتابوں میں مزارعت و مخابرت کے متعلق سرے سے الگ اور مستقل باب ہی نہیں جس طرح فقہ حنفی و فقہ شافعی وغیرہ کی کتابوں میں ہے۔ البتہ کراء الارض اور مساقات کے ابواب میں ضمناً اس کے متعلق بھی کچھ بحث آجاتی ہے لیکن وہ بھی نفی کے انداز سے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مالکیہ شرکت فی الزراعت کی کچھ صورتوں کو مانتے اور جائز تسلیم کرتے ہیں یا باغ کے اندر کچھ تھوڑی سی زرعی زمین ہو اور تبعاً وہ باغ کے معاملہ یعنی مساقات میں آجائے تو بعض شرائط کے ساتھ اس کو بھی جائز ٹھہراتے ہیں لیکن جب مزارعت سفید زمین سے متعلق مستقل ہو تو اس کو سب مالکی علماء فاسد اور قطعاً ناجائز معاملہ قرار دیتے ہیں بعض علماء جیسے امام سحنون جن کا نام عبد السلام بن سعید ہے اور مدونۃ الکبریٰ کے مؤلف و مدوّن اور چوٹی کے فقہاء و علماء میں سے تھے مزارعت کے شدید طور پر مخالف تھے اور ان کا یہ فتویٰ تھا کہ مزارعت کے ذریعے حاصل ہونے والے غلہ وغیرہ کا کھانا اور اس کی خرید و فروخت کرنا حرام ہے

مزارعت اور امام شافعیؒ

حضرت امام شافعی کے نزدیک بھی مزارعت کا معاملہ ایک باطل اور ناجائز معاملہ تھا البتہ باغ کی مساقات کو وہ جائز کہتے تھے، اس کا اظہار ان کی کتاب الام کی درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

واذا دفع الرجل الی الرجل ارضا	اور جب کوئی آدمی دوسرے کو اپنی سفید
بیضاء علی ان یزرعها المدفوعة	و خالی زمین کاشت کے لئے دے اور
الیه فما اخرج الله منها من	یہ طے کرے کہ اللہ اس زمین سے جو کچھ
شیئ فله منه جزء من	پیدا کرے گا اس میں سے ایک حصہ
الاجزاء فهذه المحاقلة و	اس کے لئے ہوگا، پس یہی وہ محاقلہ
المخابرة والمزارعة التی نهی	مخابرہ اور مزارعہ ہے جس سے رسول اللہ

عنها رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم۔ (ص ۱۰۱، ۱۰۲، ج ۷ ۔ الام) | صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے روکا اور منع فرمایا ہے۔

اس عبارت سے متصل عبارت میں فرمایا ہے: فاحللنا المعاملۃ فی النخل خبرا عن رسول اللّٰہ وحرمنا المعاملۃ فی الارض البیضاء خبرا عن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم۔ پس ہم نے باغ کے متعلق معاملے یعنی مساقات کو حلال ٹھہرایا رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی حدیث کی وجہ سے اور خالی سفید زمین کے متعلق معاملے یعنی مزارعت کو حرام کہا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کی اس حدیث کی وجہ سے جو نہی مخابرت کے متعلق ہے

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام شافعی مساقات کو حلال اور مزارعت کو حرام سمجھتے اور کہتے تھے، امام ابوحنیفہ اور ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ مساقات کے بارے میں ہے مزارعت کے بارے میں نہیں، مساقات کو امام ابوحنیفہ مزارعت کی طرح ممنوع و ناجائز معاملہ کہتے تھے جبکہ امام شافعی اس کے جواز کے قائل تھے۔

فقہ شافعی کے مستند متون (جنکی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں ہیں) سے ایک علّامہ النووی کی منہاج الطالبین ہے اس میں مزارعت سے متعلق یہ عبارت ہے:

ولا تصح المخابرۃ وھی عمل الارض ببعض ما یخرج منھا والبذر من العامل ولا المزارعۃ وھی ھذہ المعاملۃ والبذر من المالک (ص ۷۵)	اور مخابرہ صحیح نہیں اور وہ ہے زمین کو کاشت کرنا کرانا اس کی پیداوار کے ایک حصّہ کے بدلے جبکہ بیج کاشت کار کی طرف سے ہو، اور مزارعت بھی صحیح نہیں اور وہ یہی معاملہ ہے جب بیج مالک زمین کی طرف سے ہو

دوسری کتاب منہج الطلاب کی عبارت اس معاملہ سے متعلق حسب ذیل ہے:

ولا تصح مخابرۃ ولو تبعا وھی معاملۃ الارض ببعض ما یخرج منھا والبذر من العامل، ولا المزارعۃ وھی کذلک والبذر من المالک (ص ۶۲۔ علی ھامش المنھاج)	اور درست نہیں ہے مخابرہ اگرچہ وہ تبعاً یعنی مساقات کے ضمن میں ہی کیوں نہ ہو اور یہ زمین کی کاشت کا معاملہ ہے۔ اس کی پیداوار کے ایک حصّہ پہ جب کہ بیج کاشت کار کی طرف سے ہو اور نہ مزارعت درست ہے اور یہ بھی وہی معاملہ ہے جب کہ بیج مالک زمین کی طرف سے ہو۔

فقہ شافعی کی ایک اور کتاب عمدۃ السالک اور اس کی شرح فیض الالٰہ المالک میں لکھا ہے:-

العمل فی الارض ببعض ما یخرج منھا ان کان البذر من المالک سمی مزارعۃ، او من العامل سمی مخابرۃ وھما باطلتان۔ (ص ۷۱ - ج ۲)	زمین میں کاشت کا کام کرنا کرانا بعوض اس کی بعض پیداوار کے پھر اگر بیج مالک زمین کی طرف سے ہو تو اس کا نام مزارعت ہے اور کاشت کار کی طرف سے ہو تو اس کا تو اس کا نام مخابرہ ہے - اور وہ دونوں معاملے باطل ہیں ۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری کی کتاب متن التحریر میں لکھا ہے:

والمزارعۃ ان یعقد علی الارض لمن یزرعھا بجزء معلوم مما یخرج منھا والبذر من المالک فان کان من العامل فھی المخابرۃ وھی باطلۃ کذا المزارعۃ الا فی البیاض بین النخل او العنب ان عسر سقیھا الا بسقیہ (ص ۱۴۴ - متن التحریر)	مزارعت زمین کاشت کرنے کرانے کے اس معاملے کا نام ہے جو پیداوار زمین کے ایک متعین حصے پر طے پاتا ہے جبکہ تخم مالک کی طرف سے ہو اور اگر تخم عامل کی طرف سے ہو تو مخابرہ ہے، مخابرہ بھی باطل ہے اور مزارعۃ بھی، سوائے اس زمین کے جو باغ کے اندر ہو۔ کھجوروں کے یا انگوروں کے، اگر باغ کو سیراب کرنا مشکل ہو بغیر اس زمین کو سیراب کرنے کے۔ یعنی باغ کو پانی دینے سے اس کو خود بخود پانی مل جاتا ہو۔

فقہ شافعی کی مختصر اور مطوّل سب کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ مزارعت و مخابرت کا معاملہ الگ اور مستقل حرام اور باطل ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ معاملہ تو باغ کا ہو جس کا نام مساقات ہے اور اس کے ضمن میں تبعاً کچھ مزارعت بھی آجائے۔ اگرچہ بعض شافعی فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں ۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوافع میں کچھ علماء جو فقیہہ کم اور محدّث زیادہ تھے جیسے ابن خزیمہؒ، ابن المنذرؒ اور خطابیؒ وغیرہ تو وہ جواز مزارعت کی طرف مائل ہوئے ۔ لیکن فقہاء عام طور پر عدم جواز کے قائل رہے جو امام شافعی کا مسلک تھا ۔

مزارعت اور امام احمدؒ بن حنبل

ائمہ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل کے متعلق فقہ حنبلی کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مزارعت کی صرف ایک شکل جائز تھی جس میں بیج بھی مالک کی طرف سے ہو اور اگر بیج بھی کاشت کار کی جانب سے ہو تو مزارعت کی اس شکل کو وہ بھی ناجائز فرماتے تھے، مثلاً مختصر الخرقی میں ہے۔

تجوز المزارعة ببعض ما یخرج من الارض اذا کان البذر من رب الارض	پیداوار زمین کے ایک حصہ کے عوض مزارعت جائز ہے جب بیج زمین والے کی طرف سے ہو۔

اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے علامہ موفق الدین ابن قدامہ اپنی کتاب المغنی میں لکھتے ہیں:

ظاھر المذھب ان المزارعة انما تصح اذا کان البذر من رب الارض والعمل من العامل نص علیه احمد فی روایة جماعة واختارہ عامة الاصحاب (ص ۵۸۹ - ج ۵)	ظاہر مذہب یہ ہے کہ مزارعت صرف اس صورت میں صحیح ہوتی ہے جب بیج مالک زمین کی طرف سے اور کام مزارع کی طرف سے ہو ورنہ نہیں۔ امام احمد کی یہی تصریح ہے۔ ایک جماعت کی روایت کے مطابق اور اسی کو عام علماء حنابلہ نے اختیار کیا۔

مطلب یہ کہ اگر کام کے ساتھ ساتھ بیج بھی کاشت کار کی طرف سے ہو تو یہ معاملہ فاسد اور ناجائز ہو جاتا ہے جیسا کہ اس عبارت میں تصریح ہے "وقد ذکر الخرقی انه فاسد فاذا اخرج المزارع البذر فسدت" ص ۵۹۱ - ج ۵ المغنی۔

بہر حال اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ ائمہ مجتہدین میں سے تین: امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مزارعت کے متعلق قطعی فیصلہ اور طے شدہ موقف تھا کہ یہ معاملہ فاسد، باطل اور مکروہ اور حرام معاملہ ہے۔ جس سے مسلمانوں کو

ضرور بچنا چاہیئے۔ چنانچہ جہاں تک مالکیوں اور شافعیوں کا تعلق ہے وہ اپنے اماموں کی تقلید میں مزارعت کو ناجائز سمجھتے ہوئے اس معاملے سے عملاً بچتے رہے معلوم ہوا ہے کہ بعض افریقی ممالک میں جہاں مالکیوں کی عظیم اکثریت ہے وہاں مزارعت کا نام و نشان نہیں، اسی طرح جن ممالک میں شوافع کی بڑی اکثریت ہے وہاں بھی مزارعت کا کوئی رواج نہیں لیکن مقام افسوس ہے کہ امام ابوحنیفہ کی تقلید کے دعوٰی اور حنفی کہلانے کے باوجود، حنفیوں نے مزارعت کے معاملہ میں اپنے امام کے موقف و مسلک کو بری طرح نظر انداز کیا اور باوجود کمزور دلائل کے صاحبین یعنی قاضی ابویوسف اور امام محمد الشیبانی کے موقف و مسلک کو اختیار کیا اور اس پر عمل پیرا رہے اور ہیں، اگر کتاب و سنّت کے اصولی اور جزوی دلائل کے لحاظ سے صاحبین کا موقف مضبوط اور قوی ہوتا تو ترجیح کی ایک وجہ ہو سکتی تھی لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔

میں بلا خوف تردید پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی اگر کسی عدالت عالیہ کے ججوں کی ایک جماعت کے سامنے اس مسئلہ سے متعلق امام ابوحنیفہ کا موقف اور اس کے دلائل، اسی طرح صاحبین کا موقف اور ان کے دلائل پیش کئے جائیں تو وہ دلائل کے لحاظ سے امام اعظم کے موقف کو صحیح اور قوی بتلائیں گے۔ اور اس کے اسلام کے منشأ اور تصوّرِ عدل کے عین مطابق ہونے کا فیصلہ دیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مٹھی بھر مفاد پرست زمینداروں کے لئے وہ قابل عمل نہ ہو۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY
LAHORE

Vol 3 | JUNE 1984 | No. 4

آپ کے احباب کے لیے :

بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مُسلمانوں پر
قُرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجیے۔
دورانِ ماہِ رمضان اہل و عیال اور اعزّہ و اقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجیے

نوٹ

اِس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے۔ اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے!

مرکزی انجمن خدّام القرآن ——— لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن ◎ لاہور فون ۵۲۶۱۱۸